ہندوستان اور نظام قضاء

مولانا عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ

شائع کردہ
آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی

ہندوستان اور نظام قضاء

ہندوستان میں نظام قضاء کا تاریخی جائزہ اور قضاء کی ضرورت، شرعی حیثیت
اور نصب قاضی کے طریقۂ کار کے بارے میں خالص علمی اور فقہی بحث
کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں!

تالیف
مولانا عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
76A/1، مین بازار، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵
فون:-26322991، فون فیکس26314784

©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

اشاعت اول : ۲۰۰۰ء مطابق ۱۴۸۰ھ
اشاعت دوم : ستمبر ۲۰۰۷ء
اشاعت سوم : اگست ۲۰۱۰ء
کمپوزنگ : مرکزی دفتر بورڈ۔ دہلی (فیضان احمد ندوی)
پروف ریڈنگ : محمد وقار الدین لطیفی ندوی
قیمت : ۳۰/روپے

ناشر

مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ - دہلی

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	حرف چند	۵
۲	پیش لفظ وتعارف (حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ - سابق صدر بورڈ)	۷
۳	نظام قضاء اور مسلمان	۱۰
۴	ہندوستان میں قضاء شرعی کا نظام	۱۰
۵	انگریزی دور میں نظام قضاء	۱۱
۶	شریعت ایکٹ کے بعد	۱۳
۷	علماء کا کارنامہ	۱۴
۸	آزادی کے بعد	۱۶
۹	موجودہ حالات کا جائزہ	۱۷
۱۰	مسلمانانِ ہند کی ذمہ داری	۲۰
۱۱	اصلاح معاشرہ	۲۰
۱۲	دارالقضاء کا قیام	۲۲
۱۳	مقالہ کا پس منظر	۲۳
۱۴	نظام قضاء کی ضرورت	۲۴
۱۵	نصب قاضی کا شرعی حکم	۲۵
۱۶	ہندوستان میں قضاء شرعی کی ضرورت	۲۶

۱۷	قضاء شرعی کی حقیقت	۲۸
۱۸	انعقاد قضاء کے اسلامی طریقے	۳۳
۱۹	متکلمین کی تصریحات	۳۴
۲۰	اہل حل وعقد کی جانب سے نصب قاضی	۳۶
۲۱	فقہائے کرام کی تصریحات	۳۷
۲۲	نصب قاضی اور فقہاء احناف	۴۱
۲۳	امام کاسانیؒ کی ایک اصولی بحث	۴۱
۲۴	فقہائے احناف کی تصریحات	۴۴
۲۵	نصب امیر کا مسئلہ	۴۶
۲۶	ایک اہم اصولی بحث	۴۷
۲۷	چند وضاحتیں	۵۳
۲۸	چند سوالات	۵۸
۲۹	نصب قاضی کی ذمہ داری کس پر؟	۵۹
۳۰	اہل حل وعقد کی تشریح	۶۱
۳۱	کیا نصب قاضی کے لیے اتفاق شرط ہے؟	۶۴
۳۲	حاصل کلام	۶۶
۳۳	خلاصۂ بحث	۶۸
۳۴	طریقۂ کار	۶۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف چند

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی شریعت کے تئیں بیداری بڑھتی جارہی ہے اور اپنی زندگی اور سماج میں احکام شریعت کے نفاذ کے لئے جدوجہد تیز ہورہی ہے، اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہندوستان کے مختلف مقامات پر دارالقضاء کا قیام ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے ابتداء قیام سے مسلمانان ہند کو نظام قضاء قائم کرنے اور اپنے تنازعات اسلامی شریعت کی روشنی میں حل کرانے کی طرف متوجہ کیا، اور اجلاس جے پور (۱۹۹۳ء) میں ہندوستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں بورڈ کی طرف سے قیام دارالقضاء کی جدوجہد کا فیصلہ کیا اور نظام قضاء کے قیام واستحکام کو اپنے پروگرام میں شامل کیا۔

بورڈ کے اجلاس جے پور کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے مختلف صوبوں اور شہروں میں دارالقضا قائم ہوئے اور ان کی بہتر کارکردگیاں سامنے آئیں، لیکن ابھی اس کام میں مزید تیز روی اور تسلسل کی ضرورت ہے تاکہ اسلام کا نظام عدل پانی اور ہوا کی طرح ہر جگہ فراہم اور فراواں ہو۔

نظام قضاء اور قاضی کے بارے میں بہت سے علمی وفقہی سوالات اور شبہات تھے جنھیں

ہندوستان کے حالات کے پس منظر میں حل کرنے اور ازالہ شبہات کی ضرورت تھی، زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۱۹۸۷ء میں لکھی گئی، سابق صدر بورڈ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (جو تاحیات امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے قاضی القضاۃ بھی رہے) نے اسے پسند فرما کر پہلی بار امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی جانب سے شائع فرمایا اور اپنے بیش قیمت مقدمہ سے بھی اس کو آراستہ فرمایا، اس کتاب کی دوسری اشاعت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے ۲۰۰۰ء میں ہوئی، کتاب کے نسخے ختم ہو گئے اور اہل علم کی طرف سے کتاب کا مطالبہ جاری ہے خاص طور سے اہل علم کے حلقوں میں قیام دارالقضاء کے سلسلے میں ماحول سازی میں اس کتاب نے بڑا مؤثر رول ادا کیا اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس کتاب کی تازہ اشاعت کا فیصلہ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کا تازہ ایڈیشن سابق ایڈیشنوں کی طرح قبولیت حاصل کرے اور تحریک دارالقضاء کو آگے بڑھانے میں مؤثر رول ادا کرے اور بارگاہ ایزدی میں مقبول ہو۔

عتیق احمد بستوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۰۱۰/۸/۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ وتعارف

از: حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ

انصاف قائم کرنا، حقوق کی حفاظت اور شرع اسلامی کی تنفیذ امت مسلمہ کا اہم ترین فریضہ ہے، اللہ کے اتارے ہوئے قانون کو زندگی میں نافذ کر کے ہی ہم قیام عدل کے فریضہ کو انجام دے سکتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی اساس پر منظم کر سکتے ہیں، وہ مشینری جو اللہ کی شریعت کو انسانوں پر نافذ کرتی ہے اور ان کے باہمی تنازعات کو خدا کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصل کرتی ہے، اصطلاحِ شرع میں اسے قضاء کہتے ہیں اور جو اس منصب پر فائز ہو اسے قاضی کہتے ہیں۔

فقہائے اسلام نے بہت تفصیل کے ساتھ ان مسائل واحکام کو تحریر فرمایا ہے جو قضاء قاضی کے محتاج ہیں یعنی مسلمانوں کی زندگی میں روزمرہ ایسے حوادث پیش آسکتے ہیں، جن کا حل قاضی شرع ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اور یہ حالات صرف ان مسلمانوں کو نہیں جو اسلامی حکومت کے ماتحت رہتے ہوں بلکہ ان مسلمانوں کو بھی پیش آتے رہتے ہیں جو غیر مسلم اقتدار کے تحت زندگی گزار رہے ہوں۔

کتاب وسنت میں ایسا کوئی استثناء بھی نہیں کہ غیر مسلم اقتدار میں بسنے والے مسلمانوں کو ان احکام پر عمل سے چھوٹ مل گئی ہو، تو اب سیدھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلم اقتدار

کے تحت آباد اسلامی معاشرہ ان شرعی احکام پر کس طرح عمل کرے؟

ہمارے فقہاء نے حالتِ اختیار اور حالت ضرورت میں مختلف احکام میں فرق کیا ہے، بہت سی وہ صورتیں جو حالتِ اختیار میں درست نہیں، وہ حالت ضرورت میں جائز قرار پاتی ہیں اور بہت سے وہ شرائط جو حالت اختیار میں معتبر ہیں، حالت ضرورت میں ان کا اعتبار ختم ہوجاتا ہے اس کی بہت سی نظیریں فقہ کے دفاتر میں پھیلی ہوئی ہیں اور ارباب نظر سے مخفی نہیں۔

حالات کی ان تبدیلیوں کے نتیجے میں جو مسائل اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں ان کا حل ہمیشہ اصول وکلیاتِ شرع، قواعد فقہ اور شرع کے بنیادی مقاصد کو سامنے رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ جزئیات اور حوادث میں تغیر ہے، وہ وقت، زمانہ اور عرف کے پابند ہوتے ہیں، لیکن اصول وکلیات اور قواعد شرع ہر عہد میں، ہر ملک میں اور ہر عرف میں اپنی جگہ قائم و برقرار رہتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان مغل اقتدار کے زوال کے بعد کئی مشکلات سے دوچار ہوئے اور آزادی کے بعد خصوصاً پچھلے چند برسوں میں مسلم پرسنل لا کو درپیش چیلنج کی وجہ سے پیچیدگیاں اور بڑھ گئیں، اگر مسلمان مضبوط شرعی تنظیم اور منضبط نظام قضاء پورے ملک کے پیمانے پر منطقی موشگافیوں سے بلند ہوکر قواعدِ شرع کی روشنی میں قائم نہیں کرلیتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور دینی معاشرت کو شدید خطرہ پیش آسکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ہمارے دوست مولانا عتیق احمد صاحب قاسمی بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (جن کی فقہی بصیرت کا میں معترف ہوں) نے اس موضوع پر ایک محققانہ رسالہ لکھا ہے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر انہوں نے اصولی بحثیں جمع کردی ہیں اور فقہاء کی

تصریحات کو سلیقے کے ساتھ مرتب کردیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اصحاب فکر ونظر کے لیے یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا، اور دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اہم ترین فریضہ کو جسے ایمان کے بعد قوی ترین فرض قرار دیا گیا ہے، انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، مسلمانوں میں کتاب وسنت کی طرف رجوع اور اپنے قضاۃ کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا جذبہ پیدا فرمادے۔

آمین

(مولانا) مجاہدالاسلام قاسمی

(قاضی شریعت دارالقضاء مرکزی)

امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

۱۲/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ ۴/نومبر ۱۹۸۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظام قضاء اور مسلمان

تاریخ کے ہر دور میں مسلمان جہاں بھی رہے خواہ وہ حاکم بن کر رہے یا محکوم بن کر انہوں نے نظام قضاء برپا کرنا اپنا اولین دینی فریضہ تصور کیا اس لیے کہ قضاء شرعی کے بغیر مسلم معاشرے کے لیے اسلامی زندگی کا تصور ممکن نہیں، تاریخ اسلام کے ہر دور میں اسلامی عدالتوں اور مسلم قاضیوں کے بے لاگ فیصلوں نے عدل وانصاف، مساوات انسانی اور قانون شریعت کی بالادستی کی ایسی روشن مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں جن کا تصور بھی دنیاوی عدالتیں نہیں کرسکتیں، ہمارے مسلم قاضیوں نے قانون کی بالادستی قائم رکھتے ہوئے ایک معمولی رعیت کی درخواست پر خلیفۃ المسلمین، سلطانِ وقت اور بڑے بڑے جابر امراء کو فریقِ مقدمہ کی حیثیت سے اسلامی عدالت میں طلب کیا ہے اور ان کے خلاف فیصلوں کو نافذ کیا ہے، قاضیوں کے ان بے لاگ فیصلوں نے دعوتِ اسلام کے لیے راہیں ہموار کیں اور غیر مسلموں کے قلوب قبولِ اسلام کے لیے کھول دیئے۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کا نظام

ہندوستان میں سب سے پہلے جنوبی ہند اور گجرات کے ساحلوں پر مسلمانوں کے قدم پہنچے، قرون اولیٰ کے یہ مسلمان اکثر وبیشتر تجارت کے سلسلے میں ہندوستان وارد ہوئے، ان تاجروں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں، دعوت اسلام کا فریضہ بھی انجام دیا، یہ ابتدائی دور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت واقتدار، سطوت و

شوکت کا دور نہیں بلکہ ان کی محکومیت کا دور تھا، پھر بھی انہوں نے اپنی آبادیوں میں قضاء شرعی کا نظام قائم کیا اور اس وقت کے ہندو راجاؤں اور حکمرانوں نے مذہبی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان قاضیوں کی قانونی حیثیت تسلیم کی، ان کے فیصلوں کو واجب التسلیم قرار دیا، اولوالعزم مسلمان سلاطین وفاتحین نے سرزمین ہند کو فتح کرنے کے بعد پورے ہندوستان میں اسلام کا نظام عدل نافذ کیا اور تقریباً مسلمانوں کے پورے دور اقتدار میں ہندوستان پر اسلامی قانون کی بالادستی رہی، لیکن مسلم سلاطین نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں ادنیٰ مداخلت نہیں کی غیر مسلموں کو ان کے مذہب اور رسم ورواج پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی، ان کے مذہبی امور وعبادات کا انتظام وانصرام بالکلیہ انہیں کے مذہبی پیشواؤں، پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھوں میں دیدیا، ہندوؤں کو ان کے پرسنل لا پر عمل کرنے اور اپنے تنازعات ہندو پرسنل لا کے مطابق فیصل کرانے کی پوری آزادی دی۔

انگریزی دور میں نظام قضاء:

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزوں نے ہندوستان پر حکمرانی شروع کی تو انہوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کا ہر نقش ہندوستان سے مٹا دینا چاہا، تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح انہوں نے محکمۂ عدلیہ سے بھی اسلام کے اثرات محو کرنے کا منصوبہ بند پروگرام بنایا، تدریجاً انہوں نے اسلامی قوانین منسوخ کرکے اپنے وضع کردہ قوانین ہندوستان کی عدالتوں میں نافذ کئے، ۱۸۵۷ء کی جنگ میں چونکہ مسلمانوں نے قائدانہ رول ادا کیا اور ہندوستان میں برطانوی قصرِ استعمار کی بنیادیں متزلزل کردیں، اس لیے انگریزوں نے حالات پر قابو پانے کے بعد مسلمانان ہند کو ظلم وستم کا خصوصی نشانہ بنایا، مسلمانوں کو من حیث القوم فنا کے گھاٹ اتارنے اور انہیں مذہب کے عزیز ترین سرمایہ سے

محروم کرنے کا جو طویل المیعاد منصوبہ انگریزوں نے تیار کیا اسی کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کا اسلامی تشخص ختم کر دیا جائے اور مسلمانانِ ہند کو اسلامی قانون سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے اس منصوبہ کے تحت ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی برق رفتاری کے ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر کے رکھ دیا، ۱۸۶۲ء میں اسلامی تعزیرات کو منسوخ کر کے تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آیا، ۱۸۶۴ء میں زبردست قدم اٹھاتے ہوئے برطانوی حکومت ہند نے مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کر دی، ۱۸۶۴ء سے قبل ہر علاقہ میں حکومت کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے تھے، جو مسلمانوں کے خانگی اور عائلی تنازعات میں شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے ۱۸۶۴ء میں نظام قضاء کے خاتمہ کے بعد مسلمان مجبور ہو گئے کہ اپنے خالص خانگی اور عائلی جھگڑے، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق قضیے بھی غیر مسلم ججوں کی عدالت میں لے جائیں، ۱۸۷۲ء میں اسلامی قانون شہادت کی حکمرانی عدالتوں سے ختم کر دی گئی، اس کی جگہ انسانی ذہنوں کا تراشا ہوا قانون شہادت نافذ کیا گیا، غرضیکہ ایک ایک کر کے اسلامی قصرِ عدالت کی ساری اینٹیں جدا کر کے پورے عدالتی نظام کو غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا، اور یہ سب کچھ سنگینوں کی نوک پر جبر و تشدد کے سہارے کیا گیا، مسلمانوں کی آہ و فریاد، نالہ و احتجاج نے کوئی اثر نہیں کیا۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ انگریزوں کے جوشِ غضب میں اور جذبۂ انتقام میں قدرے کمی ہوئی، مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے برسرِ اقتدار قوم سے مستقل رسہ کشی قوم مسلم کے لیے مضر سمجھ کر انگریزوں سے رسم و راہ پیدا کی، مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان نفرت و عداوت کا جو گہری خلیج پیدا ہو گئی تھی اسے پاٹنے کی کوشش کی، دوسری طرف

انگریز حکام نے محسوس کیا کہ ظلم و انتقام کی پالیسی خود حکومت کے حق میں مضر ہے، ہندوستانی مسلمانوں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنے کے بعد انگریز مبصرین اس نتیجہ تک پہنچے کہ مسلمان مذہب کے سلسلے میں سب سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں اور برطانوی حکومتِ ہند سے مسلمانوں کی نفرت و عداوت کا سب سے اہم سبب ان کے دینی معاملات میں صریح مداخلت ہے، بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ منظور ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''وراثت، نکاح، فسخ نکاح بشمول طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مبارات، نفقہ، مہر، ثبوتِ نسب، امانت، جائیداد، حق شفعہ، ہبہ اور اوقاف کے معاملات میں مسلمان لازمی طور پر مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے، وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لا کا اطلاق اختیاری ہوگا۔''

شریعت ایکٹ کے بعد

شریعت ایکٹ منظور ہونے سے اسلامی قانون کے ایک جزء کو جسے ہم عائلی قوانین سے تعبیر کرتے ہیں، قانونی تحفظ حاصل ہوا لیکن عائلی قوانین کے تعلق سے دو پہلو شریعت ایکٹ منظور ہونے کے بعد بھی نظر ثانی اور ترمیم کے محتاج تھے۔(۱) مسلمانوں کے عائلی اور معاشرتی نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسلم قاضیوں کا تقرر شرعاً ضروری تھا، کیونکہ غیر مسلم جج کا فیصلہ خواہ اسلامی قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ العمل نہیں ہوتا، لہٰذا اگر ایک غیر مسلم جج خالص شریعت اسلامی کے مطابق ایک مسلمان عورت کا نکاح فسخ کرتا ہے تو شرعاً نکاح فسخ نہیں ہوتا اور وہ عورت دوسرا نکاح کرنے کی مجاز نہیں ہوتی، شریعت ایکٹ

مسلمانوں کے لیے اسی وقت کارآمد ومفید ہوسکتا تھا جب کہ مسلمانوں کے عائلی مقدمات کے فیصلے اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کے لیے ہر علاقہ میں مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے۔

(۲) دوسرا قابلِ توجہ پہلو یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کی غالب اکثریت چونکہ حنفی المسلک ہے اس لیے عدالتیں عملاً اس کی پابند تھیں کہ شریعت ایکٹ کے دائرے میں آنے والے تنازعات میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ کریں، فقہ حنفی کی رو سے فسخِ نکاح کے سلسلے میں قاضی کا دائرۂ اختیار محدود سے محدود تر ہے، عورتوں پر شوہروں کے مظالم دن بہ دن بڑھ رہے تھے، اسلامی شریعت سے دوری کی وجہ سے شوہر عموماً بیویوں کے حقوق ادا کرنے میں بڑی کوتاہی برت رہے تھے، شوہر کی مفقود الخبری، عدم ادائے نان ونفقہ، بلاوجہ ضرب وکوب اور مظالم وغیرہ کی وجہ سے بہت سی عورتیں زندگی سے عاجز تھیں، اس طرح کے حالات میں بھی فقہ حنفی کی رو سے نکاح فسخ کرنے کا اختیار قاضی کو حاصل نہیں، اس پوری صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہروں کے مظالم سے رہائی کے لیے بعض مسلمان عورتیں ارتداد کا راستہ اختیار کرنے لگیں، مسلمان عورتوں کے ارتداد کے بعض ایمان سوز، روح فرسا حوادث پیش آئے۔

علماء کا کارنامہ:

دوسرے مسئلہ کی طرف اس دور کے اکابر علماء اور فقہاء نے پوری توجہ کی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی وسرپرستی میں ''الحیلۃ الناجزہ'' کی تالیف کا انقلاب انگیز کارنامہ انجام پایا، عورتوں پر ہونے والے مظالم کا سدباب کرنے کے لیے ضرورت شدیدہ کی بناء پر چند اسباب فسخ کو فقہ مالکی سے اختیار کیا گیا اور فسخ نکاح کے سلسلے میں قاضی کے دائرۂ اختیار کو وسعت دی گئی تاکہ ستم رسیدہ عورتوں کی دادرسی عدالت کے ذریعہ کی جاسکے اور مسلمان عورتیں ارتداد جیسے ایمان سوز اقدام کا خیال دل میں نہ لائیں، حضرت تھانویؒ

نے ان مسائل پر محض اپنا فتویٰ صادر نہیں فرمایا بلکہ تمام قابل ذکر علماء ہند کا ان مسائل پر اتفاق حاصل کیا۔

الحیلۃ الناجزہ کی تالیف کے بعد حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دوسرے اکابر علماء نے مجلس قانون ساز کے بعض مسلم اراکین کو اس پر آمادہ کیا کہ الحیلۃ الناجزہ کی روشنی میں فسخ نکاحِ مسلمین کے سلسلے میں ایک بل مجلس قانون ساز میں منظور کرائیں، اس بل کا مسودہ بھی حضرات علماء نے تیار کر کے دیا، قاضی بل کا مسودہ بھی اسی کے ساتھ منسلک تھا، سید محمد احمد کاظمی نے یہ مسودۂ قانون مرکزی مجلس قانون ساز میں پیش کیا اور تین سال کے بحث و مباحثہ کے بعد ۱۹۳۹ء میں قانون ''فسخ نکاح مسلمین'' پاس ہوا، مگر بعض نام نہاد مسلم اراکین مجلس قانون ساز کی پرزور مخالفت کی وجہ سے فسخِ نکاح کے لیے مسلم قاضی کی شرط ختم کردی گئی اور مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بیسوی صدی کے ابتدائی دہوں میں پورا ہندوستان تحریک آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا، ہندوستان کی تمام قومیں ہندوستان کی آزادی کے لیے جان ومال کی بازی لگارہی تھیں، آزادی کی جدوجہد میں مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں تھے، تحریک آزادی میں مسلمان علماء، قائدین اور عوام اپنی تناسبِ آبادی سے کہیں زیادہ حصہ لے رہے تھے، تحریکِ خلافت نے آزادی کی جنگ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی، کانگریس آزادی کی جدوجہد کرنے والی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی، کانگریس کے صفِ اول کے قائدین میں بہت سے مسلم رہنما اور علماء شامل تھے، جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں شریک تھی، اس لیے آزادی سے پہلے کانگریس نے اپنی متعدد سالانہ کانفرنسوں کی قرار دادوں میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے مسئلہ کو شامل کیا، اور مسلمانوں سے صریح وعدہ کیا اور

یقین دہانی کرائی کہ آزادی کے بعد مسلم پرسنل لا کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

آزادی کے بعد:

آزادی کی صبح بڑی قربانیوں اور تمناؤں کے بعد طلوع ہوئی، لیکن یہ صبح جس کا مدتوں سے انتظار تھا، مسلمانوں کے لیے بڑی بھیانک ثابت ہوئی، تقسیمِ ملک کے نتیجہ میں نفرت و عداوت کا بادل پورے ملک پر چھا گیا، بے گناہوں کے خون سے ہندوستان کی زمین لالہ زار ہوگئی، ہندوستانی مسلمان بے پناہ خوف و ہراس میں مبتلا ہوگئے، مسلمانوں نے آزادی کا جو سہانا خواب دیکھا تھا وہ بکھر کر رہ گیا، انہیں حالات میں آئینِ ہند مرتب اور منظور ہوا، دستور ہند کے واضعین نے مذہب، زبان، تہذیب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں شامل ضرور کیا لیکن مذہب کی آزادی کا دائرہ کہاں تک ہے اس کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور اس کے دائرہ کا تعین عملاً عدلیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، حیرت ہے کہ جس دستورِ ہند میں پسماندہ اقوام اور بعض اقلیتوں کے تعلق سے معمولی جزئیات کی تفصیل موجود ہے، اسی دستور میں اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ سے متعلق ایک جملہ بھی موجود نہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ دستور ہند کے واضعین نے مسلم اراکین کی مخالفت کے باوجود دستور ہند کے ''مملکت کے رہنما اصول'' کے حصہ میں دفعہ ۴۴ کے عنوان سے یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑا ہے اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے سروں پر ننگی تلوار لٹکا دی ہے تاکہ جب بھی حالات سازگار ہوں اقلیتوں کے پرسنل لا کا سر قلم کیا جا سکے۔

موجودہ حالات کا جائزہ

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اپنی تہذیب و ثقافت، ایمان و عقیدہ، قانون و شریعت کے سلسلے میں برطانوی دور حکومت سے بھی زیادہ بھیانک اور سنگین صورت حال کا سامنا ہے، آج کل ہندوستان میں مذہبِ اسلام اور اسلامی شریعت خصوصاً اسلام کے عائلی قوانین پر ہر طرف سے وار ہو رہے ہیں، ایک طرف حکومت ہند ہے جو یکساں سول کوڈ کے لئے مسلسل اور منظم جد و جہد کر رہی ہے تاکہ ہندوستانی عدالتوں سے اسلامی شریعت کی آخری نشانی یعنی مسلم پرسنل لا کو محو اور شریعت ایکٹ (۱۹۳۷ء) کے ''مضر اثرات'' کو زائل کر سکے۔

دوسری طرف ہندو احیاء پسند تنظیمیں اور ہندو فرقہ پرست پریس ہے یہ لوگ ہندو سماج سے ''ستی'' جیسی شرمناک انسانیت سوز رسم کا تقدس تو ختم نہیں کر سکے، ایک نئے عہد میں قدم رکھنے کے باوجود ''ستی'' جیسے کتنے ناسور ہندو سماج میں فروغ پا رہے ہیں، ہندو سماج میں جہیز اور تلک کی تباہ کاریاں پورے شباب پر ہیں، آئے دن اخبارات میں اس سلسلے میں شرمناک خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، ہندو احیاء پرست اور ''مصلحین'' اپنے سماج کی خبر لینے کے بجائے مسلم خواتین کی ''ہمدردی'' میں گھلے جا رہے ہیں، مسلم خواتین خصوصاً مطلقہ عورتوں کو مسلمان مردوں کے ''مظالم اور پنجۂ استبداد'' سے رہائی دلانے کے لئے ان کی رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور دن کا سکون غائب ہو گیا ہے، اسلام دشمن فرقہ پرست پریس مسلم سماج

کی تصویر بہت بگاڑ کر پیش کر رہا ہے اور ہر مضمون کی تان اسی پر جا کر ٹوٹتی ہے کہ مسلمان خواتین کی بدحالی کا بنیادی سبب مسلم پرسنل لا ہے، لہٰذا مسلم پرسنل لا ختم کیا جانا چاہئے۔

تیسری طرف نام نہاد ترقی پسندوں اور تجدد پسندوں کا گروہ ہے، یہ لوگ اگرچہ نسلاً مسلمان ہیں، لیکن لادینی تعلیم و تربیت، ایمان سوز افکار و نظریات کے نتیجہ میں اسلامی شریعت اور مسلم اسلامی عقائد سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے، اپنے ماضی سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، یہ لوگ قرآن وسنت اور مبادیٔ اسلام کے بارے میں بھی شک وشبہ میں مبتلا ہیں اور خالص ملحدانہ افکار وعقائد میں گرفتار ہیں لیکن نسلاً مسلمان ہونے اور مسلم سماج سے بہت سے مفادات وابستہ ہونے کی وجہ سے واضح طور پر مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کی بات نہیں کہہ سکتے اس لئے اسلام کے عائلی قوانین میں اصلاح و ترمیم اور اس کی نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اس کے لئے کانفرنسیں کرتے اور فضا ہموار کرتے ہیں، لطف کی بات یہ ہے کہ اس طبقہ کی طرف سے نکاح وطلاق ومیراث کے جن مسائل میں اصلاح و ترمیم کی تجویزیں بار بار دہرائی جاتی ہیں، ان میں سے نوّے فیصد ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق قیاس واجتہاد سے نہیں بلکہ قرآن وسنت کے صریح احکام سے ہے، نام نہاد مسلمان تجدد پسندوں کا یہ طبقہ ہمارے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے، اس طبقہ کی دسیسہ کاریوں اور شک انگیزیوں کا بڑے پیمانے پر پردہ چاک کرنا ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے، کیونکہ اسلام دشمن طاقتیں ''نسلی مسلمانوں'' کے اسی طبقہ کو آلۂ کار بنا کر اسلام کے عائلی قوانین میں دخل اندازی کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔

ادھر چند برس سے ہندوستانی عدلیہ کا طرزِ عمل بھی اسلامی عائلی قوانین کے تعلق سے مسلمانوں کے لئے خاصا پریشان کن اور اضطراب انگیز ہو گیا ہے، ہندوستان کا یہ معزز ادارہ

جس نے متعدد موقعوں پر عدل وانصاف کا نام روشن کیا، اور انتہائی نازک موقعوں پر بڑے عادلانہ اور جرأت مندانہ فیصلے دئے مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں گومگو میں مبتلا نظر آتا ہے اور مسلم پرسنل لا کے قضیہ میں اس کی حیثیت جج کے بجائے فریق کی ہوگئی ہے، ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے شاہ بانو کیس میں جو فیصلہ دیا اس نے عدلیہ کے اس خطرناک رجحان کو واضح کر دیا، اس فیصلہ میں ایک طرف بڑے صریح اور تیکھے انداز میں حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دیا گیا، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ''شریعت ایکٹ'' کی پابندی عدلیہ کو سخت ناگوار ہے، دوسری طرف نفقۂ مطلقہ اور حقوقِ مطلقہ کے سلسلے کی قرآنی آیات کی ایسی من مانی تشریح کی گئی جس کی تائید چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں کسی مفسر، فقیہ وعالم کے قول سے نہیں ہوتی، اس فیصلے میں قرآنی آیات کی من مانی تعبیر وتشریح کی جو نظیر قائم کی گئی تھی اگر وہ باقی رہتی تو ''شریعت ایکٹ'' حرفِ بے معنی ہو کر رہ جاتا اور ہمارے دقیقہ سنج، نکتہ رس ماہرین قانون جس قانون پر چاہتے کھینچ تان کر قرآن وسنت کی قباقت کر دیتے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے بالکل بروقت اس فیصلے کے خلاف رائے عامہ بیدار کی، بورڈ کی قیادت نے بڑی جرأت ودانشمندی سے اس فیصلہ کے خلاف تحریک چلائی، مسلمانان ہند نے بڑے جوش وخروش سے اس تحریک کا استقبال کیا اور اسے تعاون دیا، بالآخر مسلمانوں کی سنجیدہ اور بامقصد جدوجہد رنگ لائی، مسلمانوں کی ہندوستان گیر تحریک اور دانشمندانہ افہام و تفہیم کے نتیجہ میں شاہ بانو کیس کے تباہ کن اثرات زائل کرنے کے لئے ہندوستان کی پارلیمنٹ نے مطلقہ بل منظور کیا، مطلقہ بل کے خلاف سپریم کورٹ میں متعدد رٹ دائر ہوئے، جن کا فیصلہ سپریم کورٹ نے دانیال لطیفی کیس میں اس طور پر کیا کہ نتیجۃً مطلقہ بل تقریباً حرف بے معنی ہو کر رہ گیا اور اب مسلسل شاہ بانو کیس کے فیصلہ کی طرح فیصلے عدالتوں

سے صادر ہورہے ہیں، اس کے علاوہ بعض نام نہاد مسلم خواتین اور تنظیموں کے دائر کردہ متعدد مقدمات مختلف ہائیکورٹوں اور سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہیں، جن میں مسلم پرسنل لاء کو کُلاً یا جزءاً چیلنج کیا گیا ہے۔

مسلمانانِ ہند کی ذمہ داری

مذہب و شریعت کے تعلق سے ان نازک تر حالات میں مسلمانانِ ہند کو بڑی بیداری، ہوشمندی، قربانی کا ثبوت دینا ہے، انہیں چومکھی لڑائی لڑنی ہے۔ غیروں کی سازشوں اور حملوں، اپنوں کی دسیسہ کاریوں اور ضمیر فروشیوں کا بھرپور مقابلہ کرنا ہے، مسلمان یہ چومکھی لڑائی اسی وقت کامیابی سے لڑ سکتے ہیں جب وہ ہر محاذِ جنگ پر پوری چوکسی کا ثبوت دیں اور اپنی صفوں میں انتشار نہ پیدا ہونے دیں، باطل طاقتوں کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کے ساتھ ساتھ خود مسلم سماج میں دو مثبت اور تعمیری کام ان نازک تر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ازحد ضروری ہیں۔

اصلاح معاشرہ

سب سے اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم سماج کو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے اور معاشرتی اصلاح کے لئے بڑے پیمانے پر جدوجہد کی جائے، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ اسلام کی بنیادی اور معاشرتی تعلیمات سے بالکل بے گانہ ہے، خصوصاً ہماری نئی نسل جو عصری تعلیم گاہوں میں تعلیم و تربیت پاکر نکل رہی ہے، اسلام کے بنیادی عقائد اور عائلی قوانین سے نہ صرف بیگانہ بلکہ بدظن بھی ہے، نکاح، طلاق،

میراث اور دوسرے عائلی مسائل کے بارے میں اسلامی تصورات و تعلیمات سے اکثر مسلمان ناواقف ہیں، خاندان کے افراد دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض سے بے خبر ہوتے ہیں، اسلامی تعلیمات سے بیگانگی اور صحیح اسلامی تصورات سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ہماری خانگی زندگی کا سکون غارت ہو چکا ہے اور ہر شخص دوسرے سے برسرِ پیکار ہے، ہر آن نئے نئے خانگی تنازعات وجود میں آرہے ہیں، شوہر بیوی سے ناخوش، بیوی شوہر سے تنگ، والدین اولاد سے نالاں، اور اولاد والدین سے شاکی، پھر یہ خانگی معاملات و نزاعات گھر کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہتے بلکہ بعض اوقات فتنہ و فساد، قتل و قتال، عدالتی چارہ جوئی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور یہ خانگی تنازعات عدالتوں میں پہنچنے کے بعد شاہ بانو کیس جیسی قیامت امت مسلمہ کے سر پر ڈھاتے ہیں، مخالفین کو اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے خوب خوب رنگ آمیزی کر کے مسلم سماج کی بھیانک، رسوا کن تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور اسلامی شریعت پر براہ راست حملے کریں۔

اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہندو سماج سے تاثر کے نتیجے میں بہت سی ہلاکت خیز ہندووانہ رسمیں مسلم سماج میں راہ پاگئی ہیں، ہمارے مسلم گھرانے بھی فرائض سے بڑھ کر ان رسموں کی پابندی کرتے ہیں، خواہ اس کے لئے دین و ایمان، مال و دولت، راحت و سکون سب کچھ قربان کرنا پڑے، جہیز، تلک، بارات، مشترکہ خاندان اور اس طرح کے بے شمار رسوم و آداب ہم نے غیر مسلم سماج سے قبول کر لئے ہیں، جس کے نتیجہ میں ہمارا مسلم معاشرہ شدید مصائب و مشکلات سے دوچار ہے اور ہمارے عائلی نظام کی تیلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

مسلم معاشرہ کو اسلام کے بنیادی عقائد و تعلیمات، معاشرتی تصورات سے روشناس کرانے، مسلمانانِ ہند کی زندگی صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالنے نیز معاشرتی

اصلاح اور غیر اسلامی رسوم و عادات کے استیصال کے لئے بڑے پیمانے پر مسلسل، منظم اور مثبت جد و جہد کی ضرورت ہے، یہ کام جس قدر صبر آزما اور مشکل ہے اتنا ہی ضروری ہے، اسلامی شریعت کے تعلق سے موجودہ نازک تر حالات و مشکلات کا سب سے کامیاب اور پائیدار حل یہی کام ہے، لیکن یہ کام نہ تنہا چند افراد کے بس کا ہے نہ کسی ایک جماعت کا، مسلمانوں کی تمام دینی و ملی جماعتیں اور ادارے اگر اس کام سے پوری دلچسپی لیں تو غالباً خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکے۔

دارالقضاء کا قیام

مسلم معاشرے میں کرنے کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ پورے ملک میں دارالقضاء قائم کئے جائیں، ملک کے ہر ہر علاقہ میں اسلامی عدالتوں کا جال بچھا دیا جائے، مسلمان طے کرلیں کہ اپنے مقدمات خصوصاً خانگی اور عائلی تنازعات سرکاری عدالتوں کے بجائے اسلامی عدالتوں میں لے جائیں گے اور اسلامی عدالتوں کے فیصلے خوشی خوشی اپنے اوپر نافذ کریں گے، شرعی عدالتوں کا قیام مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے اور موجودہ حالات میں اسلام کے عائلی قوانین کو اسلام دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کا تنہا راستہ بھی ہے، مسلمانوں میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ باہمی نزاعات میں شرعی عدالتوں سے فیصلہ حاصل کرنا ان کی دینی ذمہ داری ہے، پورے ملک میں شرعی عدالتوں کے لئے فضا ہموار کی جائے، شرعی عدالتیں قائم کی جائیں، یہ عدالتیں ایسی منظم باضابطہ اور احساسِ ذمہ داری کے

ساتھ کام انجام دینے والی ہوں کہ لوگوں کا ان پر پورا بھروسہ ہو۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے ضرورت اور حالات کی نزاکت محسوس کر کے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نظام قضاء قائم کرنے کی جدوجہد شروع کردی ہے، خدا کرے بورڈ کو اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو۔

مقالہ کا پس منظر:

ہندوستان میں قاضی مقرر کرنے کی شرعاً گنجائش ہے کہ نہیں؟ اگر نصبِ قاضی ہندوستان میں شرعاً درست ہے تو نصب قاضی کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ ان سوالات کے جوابات خالص علمی اور فقہی انداز میں پیش کرنے کی اگلے صفحات میں کوشش کی گئی ہے، آئندہ صفحات میں آنے والا مضمون دراصل ''ہندوستان اور مسئلہ قضاء'' کے عنوان پر ایک مقالہ ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ''کلیۃ الشریعہ واصول الدین'' کی طرف سے ہونے والی مجلس مذاکرہ کی دو نشستوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ وطلبہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، بعض بڑوں کے حکم اور احباب کے اصرار پر اس مقالہ کو کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے خاص طور سے اس مقالہ کو بہت پسند فرمایا اور اصلاح واضافہ کے سلسلے میں بعض قیمتی مشورے دئے ان کی ہمت افزائی اور توجہ ہی کے نتیجے میں یہ مقالہ زیورِ طبع سے آراستہ ہونے جارہا ہے۔

میری دعا ہے کہ ہندوستان میں شرعی عدالتوں کے قیام کے لئے فضا ہموار کرنے میں یہ رسالہ معاون ثابت ہو اور عنداللہ قبولیت کی سند حاصل کرے۔

نظام قضاء کی ضرورت

ہندوستان ہی نہیں دنیا کے جس خطے میں بھی مسلمان آباد ہیں، نظام قضاء قائم کرنا ان کا ایک اہم دینی فریضہ ہے، تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں، قرآن وسنت کا مطالبہ ہے کہ اگر باہم اختلاف ونزاع کی صورت پیدا ہوجائے تو اسلامی شریعت کے مطابق اپنے تنازعات کا فیصلہ کرائیں، اس مقصد کے لئے ہر شہر اور خطہ میں قاضی کا ہونا ضروری ہے، جو اسلامی شریعت پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ فہم و فراست، تقویٰ ودیانت کے اوصاف سے بھی متصف ہو، قرآن مجید میں ان لوگوں پر سخت نکیر کی گئی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے مقدمات لے جاتے تھے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ آمَنُوْا بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ أَنْ یَّتَحَاکَمُوْا إِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْا أَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ أَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلَالاً بَعِیْداً. (سورہ نساء آیت ۶۰)۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو (کتاب) تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں اور شیطان (تو یہ) چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈالدے۔

اللہ جل شانہ نے اس حقیقت کو بڑے زور وتاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ایمان کا

لازمی تقاضا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اپنے مقدمات عدالت محمدی میں لے جائیں اور وہاں سے صادر ہونے والے فیصلے کو دل وجان سے تسلیم کر کے اس پر عمل پیرا ہوں۔

فَلاَ وَ رَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (سورہ نساء آیت:۶۵)۔

تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ قانون شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے انہیں فاسق، کافر اور ظالم کہا گیا ہے۔

نصب قاضی کا شرعی حکم:

فقہائے اسلام نے متفقہ طور پر نصب قاضی کو فرض قرار دیا ہے، امام علاء الدین ابوبکر کاسانی متوفی ۵۸۷ھ نے لکھا ہے:

نصب القاضی فرض لأنه ینصب لإقامة أمر مفروض و هو القضاء، قال الله تعالیٰ: ﴿یا داؤد إنا جعلناک خلیفة فی الأرض فاحکم بین الناس بالحق...﴾ وقال تبارک و تعالی لنبینا المکرم علیه أفضل الصلاة والسلام: ﴿فاحکم بینهم بما أنزل الله﴾ فکان نصب القاضی لإقامة الفرض؛ فکان فرضا ضرورة (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع)۔

قاضی مقرر کرنا فرض ہے کیونکہ قاضی کا تقرر ایک فرض کام کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے، وہ فرض کام قضاء ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے داؤد ہم نے تجھے

زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرو' اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ان لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کیجئے... چونکہ قاضی کا تقرر ایک فرض کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے لہٰذا لازماً تقرر قاضی فرض ہوا۔

شمس الائمہ امام سرخسیؒ متوفی ۴۹۰ھ لکھتے ہیں:

إعلم أن القضاء بالحق من أقوى الفرائض بعد الإيمان بالله وهو أشرف العبادات. (کتاب المبسوط لشمس الدین السرخسی، ج۱۶، ص ۵۹)۔

جان لو کہ حق کے مطابق فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد اہم ترین فرائض میں سے ہے اور ساری عبادتوں سے اشرف عبادت ہے۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کی ضرورت:

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اکابر علماء کو ہر دور میں نظام امارت اور نظام قضاء کے قیام کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۳ء وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انگریزی تسلط کے بعد ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا، شاہ صاحبؒ نے اس بات پر بھی اپنے فتاویٰ میں زور دیا کہ ہر علاقہ کے مسلمان اپنا امیر مقرر کرلیں اور اسی کے ماتحتی میں وہ تمام اجتماعی کام انجام دیں جو امیر وقاضی کے بغیر انجام نہیں پاسکتے ہیں۔

اقامت جمعہ در دارالحرب اگر از طرف کفار والی مسلمان در مکانے منصوب باشد، باذن او درست والاّ مسلمانان را باید کہ یک کس را کہ امین ومتدین باشد رئیس قرار دہند کہ باجازت وحضور او اقامت جمعہ واعیاد وانکاح من لا ولی من الصغار وحفظ مال غائب وایتام وقسمات ترکات متنازع فیہا علی حسب السہام می

نمودہ باشد (مجموعہ فتاویٰ عزیزی ص ۳۴)۔

اگر کفار کی طرف سے مسلمان والی دارالحرب کے کسی مقام پر مقرر ہو تو اس کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے، ورنہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک امین اور متدین شخص کو خود ہی سردار (والی) مقرر کرلیں جس کی اجازت سے جمعہ اور عیدین قائم کی جائیں، اور اس کے حکم سے ان نابالغوں کا نکاح پڑھایا جائے جن کا کوئی والی نہیں ہے۔ غائب اور یتیموں کے مالوں کی حفاظت کی جائے اور نزاع والے ترکات کو حصص شرعیہ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۳ء نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس ہشتم منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں تحریر فرمایا تھا: آج اگر اعداد وشمار سے کام لیا جائے اور نظر تدقیق و تفتیش سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں ایسی عورتوں کی تعداد جو اپنے خاوندوں کے جور و ستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں یا خاوندوں کے مفقود اور لاپتہ ہوجانے کی وجہ سے نان شبینہ کی محتاج ہیں، یا ظالم شوہروں نے ان کو معلقہ بنا کر چھوڑ رکھا ہے، لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ایسی مظلوم عورتیں جب کہ کسی طرح اپنے خاوندوں کے جور وستم سے خلاصی حاصل نہیں کرسکتیں تو وہ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں بدحواس ہوکر ارتداد کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، ہندوستان میں اس قسم کے دلخراش اور ناگفتہ بہ کتنے ہی کیس ہوچکے ہیں جو مسلمانوں کی بدقسمتی میں ایسا اضافہ کرتے ہیں، جس کا جبراً ممکن ہے۔ ایک مسلمان کا مرتد ہوجانا بھی مسلمانوں کے لئے مصیبت کبریٰ ہے، پھر بالخصوص عورتوں کا ارتداد معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نہایت سخت مہلکہ ہے، خدا نہ کرے عورتوں میں اس قسم کی تحریک سرایت کرے۔ کیونکہ ان کی مذہبی ناواقفیت اور فطری کم عقلی خدا جانے کیا رنگ لائے گی اور مسلم قومیت کو کس قدر تباہی اور بربادی کے قریب کردے گی، دردمند مسلمانوں کا اس وقت سب سے بڑا فریضہ ہے کہ وہ ان بے کس

اور بے بس مظلوم عورتوں کی گلوخلاصی کا پہلی فرصت میں سامان کریں اور اس کی ایک ہی سبیل ہے کہ محکمۂ قضاء قائم کرانے کی کوشش کریں اور محکمۂ قضاء ان بے چاریوں کے مصائب کا علاج کرے۔(خطبہ صدارت جمعیۃ العلماء اجلاس پشاور مطبوعہ ''سچ'' لکھنؤ ۲۷ جنوری ۱۹۲۸ء ص۴)۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے مذکورہ بالا سطروں میں جس بھیانک صورتحال کی تصویر کشی کی ہے میرے خیال میں اس کی سنگینی میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا گیا، قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کے ساتھ اگر ''قاضی بل'' بھی پاس ہوگیا ہوتا تو غالباً ستم رسیدہ عورتوں کی بدحالی کا علاج ہوجاتا لیکن اولاً موجودہ پیچیدہ تر عدالتی نظام میں انصاف حاصل کرنا ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی سر کرنے سے کم نہیں ہے۔ ہماری سرکاری عدالتوں میں سب سے گراں اور کمیاب چیز انصاف ہے، ثانیاً اگر ایک مظلوم عورت ''قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کے تحت موجودہ غیر اسلامی عدالتوں سے نکاح فسخ کرانے میں کامیاب ہوگئی تو یہ فسخِ نکاح شریعت اسلامی کی نگاہ میں معتبر نہیں ہے، لہذا نظام قضاء کی ضرورت جوں کی توں قائم رہی۔

قضاء کی شرعی حقیقت

ہندوستان میں نظام قضاء کی ضرورت واضح ہونے کے بعد آیئے قضاء کی حقیقت اور اس کا دائرۂ کار معلوم کرنے کی کوشش کریں، صاحب بدائع الصنائع نے قضاء کی تعریف کی ہے:

القضاء هو الحكم بين الناس بالحق والحكم بما أنزل الله عز و جل (بدائع الصنائع ج۷، ص۲)

قضاء کے معنی لوگوں کے درمیان حق کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔

فتاوی عالمگیری میں قضاء کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

والقضاء فى الشرع قول ملزم يصدر عن ولاية عامة (فتاوی عالمگیری، ج۳ ص۳۰۶)

شریعت میں قضاء اس قول ملزم کو کہتے ہیں جو ولایت عامہ کی بنا پر صادر ہو۔

مشہور مالکی فقیہ ابن فرحون اندلسی (متوفی ۷۹۹ھ) نے حقیقت قضاء پر بحث کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے لکھا ہے:

قال ابن راشد حقيقة القضاء الإخبار عن حكم شرعى على سبيل الإلزام ... و فى المدخل لابن طلحة الأندلسي القضاء معناه الدخول بين الخالق و الخلق ليؤدي فيهم أوامره و أحكامه بواسطة الكتاب و السنة وقال القرافي حقيقة الحكم إنشاء إطلاق أو إلزام فالإلزام كما إذا حكم بلزوم الصداق أو النفقة أو الشفعة و نحو ذلک فالحكم بالإلزام هو الحكم وأما الإلزام الحسي من الترسيم والحبس فليس بحكم لأن الحاكم قد يعجز عن ذلک وقد يكون الحكم أيضاً بعدم الإلزام (تبصرة الحکام لابن فرحون المالکی، ج۱ ص۸)۔

ابن راشد نے کہا ہے: لازم کرنے کے طریقہ پر حکم شرعی کی خبر دینے کا نام قضاء ہے ...ابن طلحہ اندلسی کی کتاب المدخل میں ہے کہ قضاء کا مفہوم ہے ''کتاب و سنت کے ذریعہ خالق کے جو اوامر و احکام ہم تک پہنچے ہیں انہیں مخلوقات پر نافذ کرنے کے لئے خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ بننا۔

قرافی نے لکھا ہے حکم (قضاء) کی حقیقت چھوڑنے یا لازم کرنے کا انشاء ہے، الزام کی مثال مہر یا نفقہ یا شفعہ کے لازم ہونے کا فیصلہ کرنا ہے۔ لازم کرنے کا

فیصلہ ہی دراصل حکم (قضاء) ہے۔ رہا ''الزام حسی'' مثلاً تسیم جس تو یہ حقیقۃً حکم (قضاء) نہیں ہے، کیونکہ قاضی کبھی ''الزام حسی'' سے عاجز ہوتا ہے اور کبھی فیصلہ ہی ''عدم الزام'' کا ہوتا ہے۔

چند صفحات کے بعد ابن فرحون نے امام قرافی کا یہ قول نقل کیا ہے:

أما ولاية القضاء فقال القرافي هذه الولاية متناولة للحكم لايندرج فيها غيره ... بل الحاكم من حيث هو حاكم ليس له الا الإنشاء أما قوة التنفيذ فأمر زائد على كونه حاكما فقد يفوض إليه التنفيذ وقد لايندرج في ولايته. (تبصرۃ الحکام ج۱، ص۱۲)۔

قرافی نے منصب قضاء کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ منصب محض فیصلہ کرنے کو شامل ہے، فیصلہ کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز قضاء کی حقیقت میں شامل نہیں، قاضی کو من حیث القاضی محض انشاء حکم کا اختیار ہے، جہاں تک تنفیذی قوت کا تعلق ہے تو یہ قاضی ہونے سے زائد ایک چیز ہے، کبھی تنفیذ قاضی کو سونپی جاتی ہے اور کبھی اس کے دائرہ منصب میں شامل نہیں ہوتی۔

قضاء کا اساسی عمل اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ پر ابن خلدون کی درج ذیل عبارت سے اچھی روشنی پڑتی ہے۔

ان القاضي انما كان له في عصر الخلفاء الفصل بين الخصوم فقط، ثم دفع لهم بعد ذلك امور اخرى على التدريج بحسب اشتغال الخلفاء والملوك بالسياسة الكبرىٰ واستقر منصب القضاء آخر الأمر على أنه يجمع مع الفصل بين الخصوم استيفاء بعض الحقوق العامة للمسلمين بالنظر في أمور

المحجور عليهم من المجانين والمفلسين و أهل السفه و في وصايا المسلمين و اوقافهم و صارت هذه كلها من تعلقات وظيفة و توابع ولايته (مقدمہ ابن خلدون ج۲، ص۶۳۰، مطبوعہ دار نہضۃ، مصر، القاہرہ)۔

خلفائے راشدین کے عہد میں قاضی کا کام صرف جھگڑنے والوں میں فیصلہ کرنا تھا، پھر جس قدر سیاست کبریٰ میں خلفاء وسلاطین کی مشغولیت بڑھتی گئی اسی رفتار سے تدریجاً دوسرے کام بھی قاضیوں کے حوالے کئے گئے، آخر کار منصب قضاء کا استقرار اس پر ہوا کہ یہ منصب نزاعات کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بعض حقوق عامہ کی انجام دہی کو بھی شامل ہے، مثلاً پاگلوں، دیوالیوں، سفیہوں کے معاملات کی دیکھ بھال، مسلمانوں کی وصایا اور اوقاف کا انتظام، یہ سارے کام منصب قضاء سے وابستہ ہو گئے۔

قاضی کے اختیارات اور دائرۂ عمل کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ نے بڑی عمدہ اور متوازن بات لکھی ہے:

اعلم ان عموم الولايات و خصوصها وما يستفيده المتولى بالولاية يتلقى من الألفاظ والاحوال والعرف وليس لذلك حد في الشرع فقد يدخل في ولاية القضاء في بعض الامكنة والازمنة ما يدخل في ولاية الحرب وقد تكون في بعض الأمكنة والأزمنة قاصرة على الأحكام الشرعية فقط فيستفاد من ولاية القضاء في كل قطر ماجرت به العادة واقتضاه العرف (تبصرۃ الحکام، ج۱، ص۱۳)۔

جان لو کہ مناصب کا عموم وخصوص اور کسی منصب کے ذریعہ حاصل ہونے والے اختیارات الفاظ، احوال وعرف سے سمجھے جاتے ہیں، شریعت نے اس کی کوئی

حد بندی نہیں کی ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اور بعض زمانوں میں منصب قضاء کے اندر ''منصب جنگ'' کی ذمہ داریاں بھی شامل ہوتی ہیں، اور بعض جگہوں اور بعض زمانوں میں منصب قضاء ''شرعی فیصلوں'' کے دائرہ میں محصور رہتا ہے، لہذا منصب قضاء سونپے جانے سے ہر خطہ میں وہاں کی عادت وعرف کے اعتبار سے اختیارات حاصل ہوں گے۔

خلاصۂ بحث

اوپر ذکر کردہ اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قضاء کی اصل حقیقت ''لوگوں کے تنازعات اور مقدمات میں حق کے مطابق اور قانون الٰہی کے مطابق فیصلے کرنا ہے'' یا دوسرے الفاظ میں ''برسبیل الزام حکم شریعت کی خبر دینے کا نام قضاء ہے'' اور قضاء کی تعریف میں جو الزام مذکور ہے اس سے مراد الزام حسی نہیں بلکہ الزام معنوی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قاضی کا فیصلہ فریقین کے لئے واجب التسلیم ہوتا ہے، قاضی کے فیصلہ کے بعد مقدمہ کے فریقین کے لئے لیت ولعل اور فیصلہ سے انحراف کرنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اس کے برخلاف مفتی کے فتویٰ کی یہ حیثیت نہیں ہوتی، ایک مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے کے باوجود، مستفتی کو دوسرے مفتی کی طرف رجوع کرنے اور اس کے فتویٰ پر عمل کرنے کا شرعاً اختیار باقی رہتا ہے۔ فتویٰ میں الزام نہیں ہوتا، قاضی کے فیصلے کی الزامی حیثیت کو سمجھنے میں فقہ اسلامی کے باب التحکیم کے مطالعہ سے بڑی مدد مل سکتی ہے، اگر کسی مقدمہ کے دونوں فریق کسی شخص کو حکم مان کر مقدمہ اس کے حوالہ کردیں اور وہ حکم اپنا فیصلہ صادر کردے تو فقہاء کی تصریحات کے مطابق حکم کے دئے ہوئے اس فیصلہ میں بھی الزام ولزوم کی صفت ہوتی ہے یعنی فریقین کے لئے اس فیصلہ کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا شرعاً لازم ہوتا ہے۔ اس

الزام کا مطلب کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ حکم کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر اپنے فیصلہ کو نافذ کرانے اور اسے بروئے کار لانے کی قوت وطاقت ہو۔

تاریخ اسلام کے بیشتر ادوار میں قاضیوں کو قوتِ تنفیذ حاصل رہی لیکن قوت تنفیذ عمل قضاء کا رکن یا اس کے لئے شرط لازم نہیں ہے کہ تنفیذی قوت کے بغیر قضاء کا انعقاد ہی نہ ہوسکے، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں فصل خصومات کے سوا اور دوسرے بہت سے کام منصب قضاء سے وابستہ رہے، اور قضاۃ اسے انجام دیتے رہے لیکن ان کی حیثیت عمل قضاء کے جزء یا شرط کی نہیں تھی، میرے خیال میں یہی حیثیت فیصلوں کی عملی تنفیذ کی بھی ہے جیسا کہ امام قرافیؒ نے اس کی صراحت کردی ہے۔

مشہور حنفی فقیہ علاء الدین علی بن خلیل طرابلسی متوفی ۸۴۴ھ نے بھی حقیقتِ قضاء پر بالکل وہی بحث کی ہے جو ابن فرحون مالکی کی تبصرۃ الحکام کے حوالہ سے نقل کی گئی، ملاحظہ ہو: معین الحکام ص ۷-۸۔

انعقاد قضاء کے اسلامی طریقے

منصب قضاء کی ضرورت واہمیت اور قضاء کی حقیقت واضح ہونے کے بعد انعقاد قضاء کے شرعی طریقوں کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ قاضی مقرر کرانے کا اختیار کسے دیا گیا ہے۔

امیر المؤمنین یا سلطان مسلم کی موجودگی میں قاضی مقرر کرنے کا اختیار کلیۃً امیر یا سلطان کو ہوتا ہے یا اس قاضی القضاۃ کو جسے امیر یا سلطان نے بلاد اسلامیہ میں قاضی مقرر کرنے کا حق سونپا ہو، امیر المؤمنین یا سلطان مسلم کی موجودگی میں تمام اسلامی عہدوں کا

سرچشمہ امیر وسلطان کی ذات ہوتی ہے، سلطان یا اس کا مقرر کردہ فرد ہی اس کا مجاز ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں کے لئے اور مفاد عامہ سے تعلق رکھنے والے عہدوں پر اہل افراد کا انتخاب اور نامزدگی کرے لیکن امیر وسلطان کی عدم موجودگی میں دوسرے دینی اجتماعی عہدوں کی طرح قاضی مقرر کرنے کا اختیار بھی اہل حل وعقد کے ہاتھوں میں آجاتا ہے، امیر المسلمین اور سلطان مسلم کے نہ ہونے کی صورت میں سارے اجتماعی کاموں کی ذمہ داری عامۃ المسلمین کے سر آجاتی ہے جن کی نمائندگی اہل حل وعقد کرتے ہیں۔

متکلمین کی تصریحات

فقدانِ امام وسلطان کی صورت میں نصب قاضی کا اختیار اہل حل وعقد کو حاصل ہونا کلام وفقہ کی کتابوں میں بڑی صراحت سے مذکور ہے۔ علم کلام کی مشہور کتاب ''مواقف'' میں امامت کی بحث میں مصنف نے شیعوں کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ جب قضاء وغیرہ جزئی امور کا انعقاد اہل حل وعقد کی بیعت اور انتخاب سے نہیں ہوسکتا، تو امامت عظمیٰ کا انعقاد کیسے ہوسکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں مصنف ''المواقف'' نے وہ بات ذکر کی ہے جسے ہم یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔

> الثالث أن القضاء أمر جزئی ولا ینعقد بالبیعة فکیف الإمامة العظمیٰ؟ قلنا لا نسلم عدم انعقاد القضاء بالبیعة للخلاف فیه، وان سلم فذلک عند وجود الإمام لإمکان الرجوع إلیه فی هذا المهم، وأما عند عدمه فلابد من القول بإنعقاده بالبیعة تحصیلا للمصالح المنوطة به ودرءاً للمفاسد المتوقعة دونه (المواقف فی علم الکلام للقاضی عبدالرحمٰن بن احمد الایجی۔ صفحہ ۳۹۹ طبع عالم الکتب۔ بیروت)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ قضاء ایک جزئی کام ہے، اس کا انعقاد بھی اہل حل وعقد

کی بیعت سے نہیں ہوتا پھر امامت عظمیٰ کا انعقاد بیعت سے کس طرح ہوسکتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ بیعت کے ذریعہ منصب قضاء کے عدم انعقاد کو ہم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اس میں اختلاف ہے اور اگر بیعت کے ذریعہ عدم انعقاد قضاء کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ حکم اس صورت کا ہے جب کہ امام موجود ہو، کیونکہ اس اہم کام کے لئے امام کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے لیکن امام کی عدم موجودگی کی صورت میں تو بیعت کے ذریعہ قضاء کے انعقاد کا قائل ہونا ضروری ہے، ان مصالح کو حاصل کرنے کے لئے جو قضاء کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان مفاسد کو دفع کرنے کے لئے جو بغیر قضاء کے متوقع ہیں۔

بالکل اسی طرح کا سوال وجواب علم کلام کی دوسری مشہور کتاب مقاصد اور اس کی شروح میں بھی مذکور ہے۔

> الثانی أن أهل البیعة لا یقدرون علی تولیة مثل القضاء والاحتساب ولا علیٰ التصرف فی فرد من آحاد الأمة فکیف یقدرون علی تولیة الریاسة الکبریٰ وعلی اقدار الغیر علی التصرف فی أمر الدین والدنیا لکافة الأمة و رد بمنع الصغری فان التحکیم جائز عندنا والشاهد یجعل القاضی قادراً علی التصرف فی الغیر ولو سلم فذلک لوجود من الیه التولیة وهو الامام ولا کذلک اذا مات ولا امام غیره (شرح المقاصد للعلامۃ اسعد الدین عمر التفتازانی۔ ج ۲، ص ۲۸۱)۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اہل بیعت قضاء اور احتساب جیسا منصب کسی کے حوالہ کرنے اور امت کے ایک فرد کے بارے میں تصرف کرنے پر قادر نہیں، پھر وہ لوگ امامت عظمیٰ کے منصب پر کسی کو مقرر کرنے اور اسے پوری امت مسلمہ کے دینی اور دنیوی امور میں تصرف کا حق دینے پر کیسے قادر ہوں گے؟ صغریٰ کی

تردید کر کے اس اعتراض کا دفعیہ کیا گیا ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک حکم بنانا جائز ہے اور گواہ قاضی کو دوسرے کے بارے میں تصرف کرنے پر قادر بنا دیتا ہے، اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو اہل بیعت کی بیعت سے عدم انعقادِ قضاء اور احتساب اس صورت میں ہے جب کہ امام جسے نصب قاضی کا اختیار حاصل ہے، موجود ہے اور اگر امام کا انتقال ہو گیا دوسرا شخص امام نہیں ہوا تو مذکورہ بالا حکم نہ ہوگا۔

مواقف و مقاصد کے تمام شارحین نے جو مختلف فقہی مسالک سے تعلق رکھتے ہیں، مذکورہ بالا عبارتوں کی تشریح و تائید کی ہے اور کسی نے اپنا اختلافی نوٹ نہیں لگایا۔

اہل حل وعقد کی جانب سے نصب قاضی:

مواقف کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام المسلمین کی موجودگی میں بھی کچھ فقہاء و مجتہدین کم از کم بعض مخصوص حالات میں اہل حل وعقد کی طرف سے نصب قاضی کو درست مانتے ہیں، اس کی تائید مشہور مالکی فقیہ علامہ برہان الدین ابراہیم بن محمد بن فرحون کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

قال المازری فی شرح التلقین: القضاء ینعقدبأحد وجهین أحدهما عقد أمیر المؤمنین أو أحد أمراء ه الذین جعل لهم العقد فی مثل هذا، والثاني عقد ذوي الرأي وأهل العلم والمعرفة والعدالة لرجل منهم کملت فیه شروط القضاء وهذا حیث لایمکنهم مطالعة الإمام في ذلک ولا أن یستدعوا منه ولایتة ویکون عقدهم له نیابة عن الإمام الأعظم أو نیابة عن من جعل الإمام له ذلک للضرورة الداعیة إلی ذلک . (تبصرۃ الاحکام، ج ا

ص ۱۵-۱۶)۔

مازری نے شرح تلقین میں لکھا ہے کہ: انعقاد قضاء کے دو طریقے ہیں (۱) امیر المؤمنین یا اس کے کسی ایسے امیر کا منصب قضاء تفویض کرنا جسے امیر المؤمنین نے نصب قاضی کا اختیار دیا ہے۔ (۲) اصحاب علم و معرفت، عادل، صاحب رائے افراد کا اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو قاضی مقرر کرنا جس میں قضاء کی شرطیں موجود ہوں، دوسرا طریقہ اس جگہ درست ہوگا، جہاں کے لوگوں کا قاضی مقرر کرنے کا امام سے مطالبہ اور درخواست ممکن نہ ہو، ان لوگوں کا قاضی مقرر کرنا امام کی نیابت میں یا اس شخص کی نیابت میں ہوگا، جسے امام نے نصب قاضی کا اختیار دیا ہے کیونکہ ضرورت اس کی داعی ہے۔

فقہائے کرام کی تصریحات:

امام و سلطان کی عدم موجودگی میں اہل حل وعقد اور عامۃ المسلمین کی طرف سے قاضی مقرر کئے جانے کا مسئلہ چاروں فقہی مسالک کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے۔

پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنبلی فقیہ ابو یعلی محمد بن الحسین الفراء متوفی ۴۵۸ھ لکھتے ہیں:

ولو أن أهل بلد قد خلا من قاض اجمعوا علی أن قلدوا علیهم قاضیا نُظرت فإن کان الإمام موجوداً بطل التقلید، وإن کان مفقوداً صح، ونفذت أحکامه علیهم، فإن تجدد بعد نظره أمام لم یستدم النظر إلا بعد إذنه ولم ینقص ماتقدم من حکمه (الاحکام السلطانیہ للقاضی ابی یعلی محمد بن حسین الفراء ص: ۷۳، امام ابوالحسن ماوردیؒ متوفی ۴۵۰ھ کی کتاب الاحکام السلطانیہ میں بھی بالکل یہی مسئلہ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۶۳، ۶۴ مطبعۃ السعادۃ

مصر)۔

اگر کوئی شہر قاضی سے خالی ہوگیا اور وہاں کے لوگوں نے مجتمع ہوکر اپنے لئے کوئی قاضی مقرر کرلیا تو دیکھا جائے گا کہ امام موجود ہے یا نہیں، اگر امام موجود ہو تو ان لوگوں کا قاضی مقرر کرنا باطل ہے، اور اگر امام مفقود ہے تو قاضی مقرر کرنا صحیح ہے اور اس قاضی کے فیصلے ان لوگوں پر نافذ ہوں گے، اگر اس شخص کے قاضی مقرر ہونے کے بعد کوئی شخص منصب امامت پر متمکن ہوا تو اس نئے امام کی اجازت کے بغیر یہ قاضی منصب قضاء پر برقرار نہیں رہ سکتا، لیکن اس سے پہلے وہ قاضی جو فیصلے کرچکا ہے وہ نہیں توڑے جائیں گے۔

فقہ شافعی کی مشہور کتاب فتح المعین میں ہے:

لا بد من تولية من الامام او ماذونه ولو لمن تعين للقضاء، فان فقد الامام فتولية أهل الحل و العقد فى البلد او بعضهم مع رضا الباقين ولو ولاّه اهل جانب من البلد صح فيه دون الآخر (فتح المعین ص۲۱۰-۲۱۱)۔

امام یا اس کے اجازت یافتہ شخص کی طرف سے منصب قضاء کی تفویض ضروری ہے، اس شخص کے لئے بھی جو تنہا قضاء کی اہلیت رکھتا ہو، اگر امام مفقود ہو تو شہر کے تمام اہل حل وعقد کی طرف سے تفویض قضاء ضروری ہے یا بعض نے تفویض کی ہو باقی لوگوں کی رضامندی کے ساتھ، اگر شہر کے ایک جانب والوں نے قاضی بنایا ہے تو انہیں لوگوں کے حق میں قضاء صحیح ہوگی دوسری جانب والوں کے لئے نہیں۔

اعانۃ الطالبین شرح فتح المعین میں عبارت بالا کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''شہر کے دوسرے حصّے کے لئے قاضی کے تقرر کا صحیح نہ ہونا اس وقت ہے جب شہر کے دوسرے حصّے کے باشندے اس قاضی پر راضی نہ ہوں ورنہ تو شہر کے دوسرے حصہ کے لئے

بھی قاضی کا تقرر صحیح ہوجائے گا (اعانۃ الطالبین شرح فتح المعین ص۲۱۰-۲۱۱)۔

علامہ ابوالحسن اصحی شافعیؒ کا فتویٰ اس مسئلہ میں یہ ہے:

اذا عدم فى قطر ذو شوكة و حاكم ولم يوجد للمرأة ولى ولا للأطفال وصى فهل لجماعة من أهل البلاد نصب فقيه، يتعامل فى الابضاع والأموال فأجاب الاصبحى رحمه الله بقوله نعم، اذا لم يكن رئيس يرجع أمرهم اليه اجتمع ثلاثة من أهل الحل والعقد و نصبوا قاضياً (الفتاویٰ الکبریٰ لابن حجر المکی الہیثمی جلد۴، ص۳۲۶)

(سوال کیا گیا) کہ جب ملک کے کسی نواح میں حاکم نہ رہے اور عورت کے لئے ولی نہ ہو اور بچوں کے لئے وصی نہ ہو تو کیا شہر کے لوگوں میں سے کسی جماعت کو یہ اختیار ہے کہ قاضی نصب کرے، جو لوگوں کے ناموس اور اموال کے احکام انجام دے، تو علامہ اصحیؒ نے جواب دیا کہ ہاں جب کوئی امیر نہ رہے جو ان شرعی امور کا مرجع ومرکز ہو تو اہل حل وعقد میں سے تین شخص جمع ہوکر قاضی مقرر کرلیں۔

فقہ مالکی کی ایک عبارت تبصرۃ الحکام کے حوالہ سے گذر چکی ہے جس سے معلوم ہوا کہ فقہاء مالکیہ بعض مخصوص حالات میں ضرورت کی بنا پر امام المسلمین کی موجودگی میں بھی اہل حل وعقد کی طرف سے نصب قاضی کو درست مانتے ہیں، اس سے یہ بات خود واضح ہوجاتی ہے کہ امیر وسلطان کی عدم موجودگی میں فقہاء مالکیہ کے نزدیک اہل حل وعقد کی جانب سے قاضی مقرر کیا جانا بدرجۂ اولیٰ درست ہوگا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے الحیلۃ الناجزہ کی تالیف کے زمانہ میں مسائل تنقیح کے لئے بہت سے سوالات فقہاء مالکیہ کی خدمت میں پیش کئے اور وہ تمام

سوالات اوران کے جوابات ''الحیلۃ الناجزہ'' میں شامل فرمائے، حضرت تھانویؒ کا ایک ذیلی سوال یہ تھا۔

ان المسلمین اذا کانوا تحت حکومۃ غیر مسلم ولم یکن ثمہ قاض من جانب الحکومۃ فھل یصح نصب القاضی من عامۃ المسلمین مع ان القوۃ لا تحصل بمجرد نصبھم (الحیلۃ الناجزہ ص۱۵۷ مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند)۔

مسلمان اگر غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہوں اور وہاں حکومت کی طرف سے کوئی قاضی نہ ہو تو کیا عامۃ المسلمین کی جانب سے قاضی مقرر کیا جانا درست ہوگا، باوجود یکہ محض عامۃ المسلمین کے قاضی مقرر کردینے سے قاضی کو قوت تنفیذ حاصل نہ ہوگی۔

جس سوالنامہ میں یہ سوال شامل تھا اس کا جواب دو فقہاء مالکیہ نے دیا، حرم نبوی کے مدرس شیخ عبداللہ فوتی سوال بالا کے جواب میں لکھتے ہیں۔

لامانع من ذلک اذا اضطر الناس الی ذلک بما دل علیہ ظاھر کلام اھل المذھب (الحیلۃ الناجزہ، ص۱۶۱)

جب لوگوں کو اس کی ضرورت ہو تو ایسا کرنے سے کوئی مانع موجود نہیں جیسا کہ علماء مذہب کے ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد شیخ عبداللہ فوتی نے اپنے جواب کی تائید میں فقہاء مالکیہ کی نصوص پیش کی ہیں۔

مذکورہ بالا سوالنامہ کا دوسرا جواب علامہ صالح تونسی نے دیا ہے، انہوں نے اوپر ذکر کردہ سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے۔

ونصب جماعۃ المسلمین لقاض یفصل بینھم الخصومات و

یقطع المنازعات جائز بل یتعین فی بعض الاحیان علی الاعیان اذا وجدوا سبیلا الیہ و عدم معارض فیہ واجتماع الکلمۃ علیہ (الحیلۃ الناجزہ:۱۶۵)

مسلمانوں کی جماعت کا ایک قاضی مقرر کرنا جو ان کے مقدمات کا فیصلہ کرے اور نزاعات کو ختم کرے جائز ہے بلکہ بعض اوقات قاضی مقرر کرنا سر برآوردہ افراد پر واجب ہو جاتا ہے، جب کہ ایسا کرنا ان کے لئے ممکن ہو، مخالفت نہ ہو اور اتحاد قائم ہو جائے۔

نصب قاضی اور فقہائے احناف

متکلمین اسلام، فقہاء مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ، کی واضح تصریحات پیش کرنے کے بعد اب ہم فقہ حنفی کی طرف رجوع کرتے ہیں، غیر مسلموں کے زیر اقتدار بسنے والے مسلمانوں کے لئے نظام قضاء کے قیام کی مشروعیت اور ضرورت نیز مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کی صحت فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں بھی وضاحت کے ساتھ مذکور ہے لیکن چونکہ زیر بحث مسئلہ سے متعلق فقہ حنفی کی عبارتیں ایک مدت سے بحث ونظر کا موضوع بن چکی ہیں، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مسئلہ زیر بحث سے متعلق پہلے متکلمین اسلام، فقہاء مالکیہ، شوافع، حنابلہ کی عبارتیں قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کردی جائیں تاکہ فقہاء احناف کی عبارتوں کی مراد متعین کرنے میں ہمیں سہولت ہو۔

امام کاسانیؒ کی ایک اصولی بحث

زیر بحث جزئیہ سے ذرا ہٹ کر آیئے مشہور حنفی فقیہ امام علاء الدین ابوبکر کاسانیؒ کی ایک اصولی گفتگو پر نظر ڈالتے چلیں، موصوف نے لکھا ہے کہ جن اسباب کی بنا پر وکیل کی

وکالت ختم ہوجاتی ہے،انہیں اسباب کی بنا پر قاضی منصب قضاء سے محروم ہوجاتا ہے۔اس کے بعد وکیل اور قاضی کا فرق بیان کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے:

ان الموکل اذا مات او خلع ینعزل الوکیل والخلیفة اذا مات او خلع لا تنعزل قضاته وولاته، ووجه الفرق ان الوکیل یعمل بولایة المؤکل وفی خالص حقه ایضا وقد بطلت اهلیة الولایة فینعزل الوکیل والقاضی لا یعمل بولایة الخلیفة وفی حقه بل بولایة المسلمین وفی حقوقهم، وانما الخلیفة بمنزلة الرسول عنهم لهذا لم تلحقه العهدة کالرسول فی سائر العقود والوکیل فی النکاح، واذا کان رسولا کان فعله بمنزلة فعل عامة المسلمین، وولایتهم بعد موت الخلیفة باقیة فیبقی القاضی علی ولایته وهذا بخلاف العزل فان الخلیفة اذا عزل القاضی او الوالی ینعزل بعزله ولا ینعزل بموته لانه لا ینعزل بعزل الخلیفة ایضاً حقیقة بل بعزل العامة لما ذکرنا أن تولیته بتولیة العامة، والعامة ولّوه الاستبدال دلالة لتعلق مصلحتهم بذلک فکانت ولایته منهم فی العزل ایضاً، فهو الفرق بین العزل والموت.
(بدائع الصنائع ج۷،ص۱۶)۔

مؤکل کا جب انتقال ہوجائے یا معزول کردیا جائے تو اس کا وکیل معزول ہوجائے گا اور خلیفہ کی وفات یا برطرفی سے اس کے مقرر کردہ قاضی اور حاکم معزول نہیں ہوتے ،دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ وکیل موکل کی ولایت کی وجہ سے اور خالص موکل کے حق میں عمل کرتا ہے اور (موت یا برطرفی کے نتیجہ میں) موکل کی اہلیت ولایت باطل ہوچکی ہے اس لئے وکیل معزول ہوجائے گا،اور قاضی خلیفہ کی ولایت سے اور اس کے حق میں عمل نہیں کرتا بلکہ قاضی مسلمانوں

کی ولایت کی وجہ سے اور مسلمانوں کے حقوق میں عمل کرتا ہے،خلیفہ کی حیثیت محض مسلمانوں کے قاصد اور پیامبر کی ہے اسی وجہ سے قاضی کے قضاء کی ذمہ داری خلیفہ کو لاحق نہیں ہوتی ،جس طرح تمام عقود میں پیام رساں پر ذمہ داری نہیں آتی ،اور نکاح میں وکیل پر ذمہ داری نہیں آتی ،جب خلیفہ کی حیثیت پیام رساں کی ہوئی تو اس کا کام عامۃ المسلمین کے کام کے درجہ میں ہوا۔اور خلیفہ کی وفات کے بعد بھی عامۃ المسلمین کی ولایت باقی ہے۔لہذا قاضی اپنے منصب پر باقی رہے گا، برخلاف معزولی کے، کیونکہ خلیفہ اگر قاضی یا والی کو معزول کردے تو قاضی اور والی اس کے معزول کرنے سے معزول ہوجائیں گے اور اس کی وفات سے معزول نہیں ہوں گے اس لئے قاضی درحقیقت خلیفہ کے معزول کرنے سے معزول نہیں ہوتا ہے بلکہ عامۃ المسلمین کے معزول کرنے سے معزول ہوتا ہے،اس کی وجہ وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ خلیفہ کی تولیت عامۃ المسلمین کی تولیت ہے،اور عامۃ المسلمین نے دلالۃً ایک قاضی کی جگہ پر دوسرے قاضی کی تقرری کی ولایت دی ہے کیونکہ اس سے ان کے مصالح وابستہ ہیں،پس معزول کرنے میں بھی عامۃ المسلمین ہی کی جانب سے خلیفہ کو ولایت حاصل ہے،معزول کرنے اور وفات میں یہی فرق ہے۔

امام کاسانیؒ کی مذکورہ بالا عبارت اصولی اعتبار سے بڑی جامع ہے اس سے معلوم ہوا کہ خلیفۃ المسلمین کو والیوں اور قاضیوں کے نصب وعزل کا اختیار نیابۃً عن المسلمین حاصل ہوتا ہے،مسلمانوں کے دینی اجتماعی عہدوں پر اہل افراد کی نامزدگی اور تولیت میں خلیفہ کی حیثیت عامۃ المسلمین کے پیام رساں کی ہوتی ہے،غرضیکہ ولایات اسلامیہ کا اصل سرچشمہ عامۃ المسلمین ہیں، اسی لئے خلیفہ کی وفات کے بعد بھی قاضی اور والی اپنے مناصب پر برقرار رہتے ہیں، جب یہ صورتِ حال ہے تو امام وسلطان کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کا

نامزد کیا ہوا والی یا قاضی شرعاً والی یا قاضی کیوں نہ ہوگا۔

فقہائے احناف کی تصریحات

امام کاسانیؒ کی اصولی گفتگو کے بعد آیئے زیر بحث مسئلہ سے متعلق فقہاء احناف کی عبارتوں کا مطالعہ کریں، جامع الفصولین کے مصنف شیخ محمود بن اسرائیل متوفی ۸۲۳ھ نے اپنی کتاب کا آغاز دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث سے کیا ہے آغاز کتاب ہی میں انہوں نے دارالاسلام اور دارالحرب پر تفصیلی بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ ہمارے زمانے کا اہم اور زندہ مسئلہ ہے اس لئے ہم نے اس بحث کو اولیت دی ہے۔ اسی بحث میں صاحب جامع الفصولین لکھتے ہیں:

> **وکل مصر فیه وال مسلم من جهة الكفار تجوز فيه إقامة الجمعة والاعياد، واخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الأيامىٰ لاستيلاء المسلم عليهم وأما طاعة الكفرة فهى موادعة و مخادعة و اما فى بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمعة والاعياد ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين و يجب عليهم طلب وال مسلم** (جامع الفصولین، جلد اول ص ۱۴، مطبوعہ اسلامی کتب خانہ کراچی)۔
>
> ہر وہ شہر جس میں کفار کی طرف سے مسلمان والی ہو، وہاں جمعہ اور عیدین قائم کرنا، خراج کی وصولی، قاضی کی تقرری، ایامیٰ کا نکاح جائز ہے کیونکہ مسلمانوں پر مسلمان والی ہی کا استیلاء ہے، اور کافروں کی اطاعت کی حیثیت موادعت اور مخادعت کی ہے، اور جن شہروں میں کافر والی ہوں وہاں کے مسلمانوں کے لئے جمعہ اور عیدین قائم کرنا جائز ہے اور (ایسی جگہ) مسلمانوں کا قاضی مسلمانوں کی رضامندی سے ہوگا، اور مسلمانوں کے لئے واجب ہے کہ مسلمان والی کی جستجو کریں۔

جامع الفصولین کی اس عبارت میں غیر مسلموں کے زیر اقتدار مسلم آبادی کے علاقوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ (۱) وہ شہر اور علاقے جہاں غیر مسلم سلطان کی طرف سے مسلمان حاکم مقرر ہیں۔ (۲) وہ شہر اور علاقے جہاں پر سلطان کافر نے غیر مسلم حاکم مقرر کر دئے ہیں۔ پہلی قسم کے شہروں کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ مسلمان حاکم تمام دینی اجتماعی امور کا انتظام کرے گا، جمعہ اور عیدین کے لئے ائمہ مقرر کرے گا، عشر و خراج وصول کرے گا، قاضی مقرر کرے گا، غرضیکہ امام المسلمین کی ذات سے جتنے اجتماعی امور وابستہ ہوتے ہیں، سب کی انجام دہی اور نظم و انتظام یہ مسلمان حاکم کرے گا، کیونکہ یہاں کے باشندوں پر عملی حکمرانی اسی مسلمان والی کو حاصل ہے، اس نے غیر مسلم سلطان کی اطاعت اور وفاداری کا جو اظہار کیا ہے اس کی حیثیت محض حالات کی مجبوری کی بنا پر ایک مصالحت اور سیاسی اقدام کی ہے۔

دوسری قسم کے شہروں کے بارے میں مصنف نے تحریر فرمایا ہے کہ چونکہ یہ شہر مسلمان والی سے خالی ہیں، اس لئے مسلمان خود اپنے اجتماعی امور کا انتظام کریں گے، جمعہ اور عیدین کے لئے ائمہ مقرر کر کے جمعہ اور عیدین قائم کریں گے، باہمی تراضی سے فصل خصومات کے لئے قاضی مقرر کریں گے، لیکن قاضی مقرر کرنے کے بعد بھی وہاں کے مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہوگی کہ ایک مسلمان والی مقرر کرنے کے لئے جد و جہد کریں، کیونکہ قاضی کے ذریعہ دین کے صرف ایک اجتماعی شعبے کا نظم قائم ہوگا اور والی کے دائرہ میں دین کے تمام اجتماعی شعبے ہوتے ہیں، لہذا قاضی مقرر کر لینے سے مسلمان نصب امیر کی ذمہ داری سے عہد برآ

نہیں ہوسکتے، گویا یہ اجتماعی نظم قائم کرنے کی مرحلہ وار کوشش ہے، کیونکہ کوئی منصب جس قدر ذمہ داری اور اختیارات کا ہوتا ہے اتنا ہی اس منصب کے لئے کسی فرد کا انتخاب اور اس پر لوگوں کا اتفاق دشوار تر ہوتا ہے، بسا اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں کہ منصب قضاء کے لئے کسی فرد پر اہل شہر کا اتفاق ہوسکتا ہے لیکن نصب والی کے لئے اہل شہر کی تراضی کے امکانات نہیں ہوتے، ایسے وقت میں تقرر والی کے لئے حالات سازگار نہ ہونے کی بنا پر قضاء کا کام معطل نہیں رہ سکتا بلکہ اہل شہر کا فریضہ ہوگا کہ قاضی مقرر کر کے قضاء کا عمل جاری کریں۔

نصب امیر کا مسئلہ

جو شہر اور علاقے مسلمان امیر اور والی سے خالی ہیں، اگر وہاں ابتدائی مرحلے ہی میں والی مقرر کرنے کے لئے تراضی واتفاق حاصل ہوسکتا ہو تو بہتر صورت یہ ہے کہ اہل حل وعقد والی کا انتخاب کرلیں اور والی مسلم جمعہ واعیاد کے لئے ائمہ اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے قضاۃ مقرر کرے نیز دیگر اجتماعی شعبوں کا نظم وانتظام سنبھالے، مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ نے لکھا ہے:

> واذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما هو فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبه فی بلاد المغرب الآن و بلنسیة و بلاد الحبشه واقروا المسلمین عندهم علی مال یوخذ منهم، یجب علیهم ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیاً فیولی قاضیا أو یکون هو الذی یقضی بینهم (فتح القدیر شرح الہدایہ جلد ۵ ص ۴۶۱، مطبوعہ دار صادر، بیروت)۔
>
> اور جب (مسلم) بادشاہ نہ ہو اور نہ ایسا شخص ہو جس کی طرف سے نصبِ قاضی

> جائز ہو، جیسا کہ ان بعض شہروں کی حالت ہے جس پر کفار غالب ہوگئے مثلاً آج کل بلاد مغرب میں قرطبہ، بلنسیہ، اور بلاد حبشہ اور (غالب ہونے کے بعد) کفار نے کچھ مال (خراج) لے کر ان شہروں میں مسلمانوں کو اپنی زیر حکومت قیام کی اجازت دے دی ہے تو ایسی حالت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی جماعت میں سے کسی شخص کو متفق ہو کر والی بنائیں، پس وہی والی قاضی مقرر کرے یا خود ہی مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرے۔

اوپر جامع الفصولین کی جو عبارت نقل کی گئی ہے بعینہ وہی عبارت یا اس کے ہم معنی عبارتیں فقہ حنفی کی متعدد مستند کتابوں میں مذکور ہیں، اس سلسلہ میں طحطاوی (ج ۱ ص ۳۳۹)، شامی (ردالمحتار مشہور بہ شامی، ج ۴ ص ۳۴۲ مطبوعہ المکتبہ الرشیدیہ، کوئٹہ، پاکستان) اور البحر الرائق (ج ۶ ص ۲۹۸) کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک اہم اصولی بحث

خلیفہ وسلطان کی عدم موجودگی میں تمام اسلامی عہدوں کی تولیت عامۃ المسلمین کے ہاتھوں میں آجاتی ہے بلکہ فقہاء کی تصریحات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کی موجودگی میں بھی اگر کسی اسلامی منصب پر خلیفہ کی جانب سے نامزدگی پر معاملہ موقوف رکھنے میں کسی اہم دینی کام کا تعطل لازم آتا ہو یا کسی بڑے ضرر کا خطرہ ہو تو خلیفہ کی طرف سے منصب کی سپردگی پر اجتماعی دینی کام کو موقوف نہیں رکھا جائے گا بلکہ مسلمان خود مصالح شریعت اور ضرورتِ وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس دینی کام کے لئے کسی کو منتخب کریں گے، مثلاً اقامتِ

جمعہ وعیدین بھی شرعاً خلیفۃ المسلمین سے وابستہ ہے، خلیفۃ المسلمین یا اس کا نامزد کیا ہوا حاکم یا اس کا مقرر کیا ہوا امام ہی جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھائے گا، لیکن اگر کسی علاقے کے نامزد حاکم کا اگر اچانک انتقال ہوگیا اور معاملہ دارالخلافۃ سے دور دراز علاقہ کا ہے۔ کوئی دوسرا شخص بھی نہیں جو خلیفہ کی طرف سے اقامتِ جمعہ واعیاد کا مجاز ہو نہ وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ خلیفہ کو حاکم کی وفات سے مطلع کر کے دوسرا حاکم نامزد کرایا جائے، اور وہ جمعہ پڑھائے تو ایسے حالات میں خلیفہ کی طرف سے حاکم یا امام کی نامزدگی کا انتظار نہیں کیا جائے گا بلکہ شہر کے لوگ جس شخص کو امام جمعہ بنادیں وہی نماز جمعہ پڑھانے کا مجاز ہوجائے گا۔ امام سرخسیؒ مبسوط میں لکھتے ہیں:

فقد ذكر ابن رستم عن محمد رحمهما الله انه لو مات عامل افريقية فاجتمع الناس على رجل فصلىٰ بهم الجمعة أجزاهم لأن عثمان رحمه الله لما حصر اجتمع الناس على علي رضى الله عنه فصلىٰ بهم الجمعة ولان الخليفة انما يامر بذلک نظراً منه لهم فاذا نظروا لانفسهم واتفقوا عليه كان ذالک بمنزلة امر الخليفة اياه. (مبسوط جلد ثانی، ص ۳۵، ۳۴)۔

ابن رستم رحمۃ اللہ نے امام محمدؒ سے روایت کی ہے کہ اگر (مثلاً) افریقہ کا عامل مرگیا، پس وہاں کے لوگوں نے ایک شخص پر اتفاق کرلیا اور اس شخص نے ان کو نماز جمعہ پڑھائی تو بالکل درست ہے اس لئے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور ہوگئے تھے تو اس وقت مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اتفاق کیا اور انہوں نے نماز جمعہ پڑھائی، اور دوسری دلیل یہ ہے کہ خلیفہ جو کسی کو نامزد کرتا ہے تو مسلمانوں کے فوائد کو از خود غور کر کے مقرر کرتا ہے، پس (بحالت مجبوری) جب مسلمانوں نے اپنے فوائد کا خود لحاظ کیا اور ایک شخص پر

متفق ہوگئے تو یہ اس مرتبہ میں ہوگا کہ خلیفہ نے خود اس کو مقرر کیا۔

اسلامی افواج کے لئے امیر لشکر مقرر کرنے کا اختیار بھی اصلاً خلیفۃ المسلمین کو حاصل ہوتا ہے، اگر خلیفہ نے لشکر منظم کر کے ایک شخص کو امیر لشکر مقرر کیا اور اس فوج کو کسی محاذ پر روانہ کیا، خلیفہ کا مقرر کیا ہوا امیر لشکر جہاد میں شہید ہوگیا تو ظاہر بات ہے کہ ان حالات میں نئے امیرِ لشکر کی تقرری کے لئے خلیفہ سے پروانہ حاصل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ عین حالت جنگ میں اگر جہاد کا عمل موقوف کر دیا گیا اور خلیفہ کے پروانہ کا انتظار کیا جانے لگا تو اسلامی فوج کو غیر معمولی ضرر لاحق ہوگا اور شکست کی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا خلیفہ کے پروانے کا ادنیٰ انتظار کئے بغیر اس فوج کے سپاہی اپنے میں سے کسی کو امیر الجیش مقرر کرلیں گے، چنانچہ غزوہ موتہ میں ایسا ہی ہوا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ موتہ کے لئے ترتیب وار تین امیر الجیش مقرر کئے تھے (۱)۔ حضرت زید بن حارثہؓ (۲) حضرت جعفر طیارؓ (۳) حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، جہاد میں تینوں شہید ہوگئے، اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے آپ مشہور سیرت نگار ابن ہشامؒ کے حوالہ سے پڑھئے:

ثم اخذ الراية ثابت ابن اقرم اخوبنى العجلان، فقال: يا معشر المسلمين: اصطلحوا على رجل منكم، قالوا: انت، قال: ما انا بفاعل فاصطلح الناس على خالد بن الوليد فلما اخذ الراية دافع القوم و خاشى بهم (السیرۃ النبویہ لابن ہشام علیٰ ہامش الروض الانف للسہیلی ج ۲، ص ۲۵۸، مطبوعہ المکتبۃ الفاروقیہ، ملتان، پاکستان)

پھر بنو عجلان کے ایک فرد ثابت بن اقرم نے جھنڈا لے لیا اور انہوں نے کہا: اے مسلمانو! اپنے میں سے کسی فرد کی امارت پر متفق ہوجاؤ، لوگوں نے کہا: آپ مناسب ہیں، انہوں نے کہا: میں تیار نہیں ہوں، اس کے بعد تمام لوگ خالد بن

ولید کی امارت پر متفق ہوگئے، جب حضرت خالد بن ولید نے جھنڈا لیا مسلم فوج کو دشمنوں سے بچا کر ایک طرف اٹھا کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کے مجاہدین کی طرف سے امیر الجیش کی تقرری پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

غزوۂ موتہ ہی سے متعلق ایک حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے، اس حدیث سے ہمارے محدثین نے زیر بحث مسئلہ کے بارے میں بہت سے فوائد مستنبط کئے ہیں اس لئے یہاں پر اس کا ذکر مناسب ہے۔

عن انسؓ بن مالک قال، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اخذ الراية زيد فاصيب، ثم اخذها جعفر فاصيب، ثم اخذها عبد الله بن رواحة فاصيب وان عيني رسول الله صلى الله عليه وسلم لتنذر فان ثم اخذها خالد بن وليد من غير امرة فتح له (بخاری شریف جلد اول، ص ۱۶۷)۔

انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زید نے جھنڈا لیا وہ شہید کردئے گئے، پھر جعفر نے جھنڈا لیا وہ شہید کردئے گئے، پھر عبد اللہ بن رواحہ نے جھنڈا لیا، وہ بھی شہید کردئے گئے (یہ کہتے ہوئے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے، پھر خالد بن ولید نے جھنڈا لیا (دربارِ رسالت سے) امیر بنائے جائے بغیر تو اللہ نے ان کے ہاتھوں فتح نصیب فرمائی۔

اس حدیث کے الفاظ ''من غیر امرۃ'' کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۵۱۳، مطبوعہ المطبعۃ السلفیہ) کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو امیر نہیں بنایا تھا، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ از

خود امیر الجیش بن گئے تھے کیونکہ روایات صحیحہ سے ثابت ہے کہ مجاہدین نے متفق ہو کر انہیں امیر منتخب کیا تھا۔

علامہ بدالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ نے اس حدیث سے انتہائی اہم کلی مسئلہ کا استنباط کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

وفيه جواز تولى امر القوم من غير تولية اذا خاف ضياعه وحصول الفساد بتركه (عمدۃ القاری ج ۶، ص ۳۷۹)

اس حدیث سے اس امر کا جواز ثابت ہے کہ قوم کے کاموں کا ولی ہونا چاہئے (اگرچہ خلیفہ یا قائم مقام خلیفہ کی طرف سے ولی نہ بنایا گیا ہو) جب قومی کام کے ضائع ہونے کا خوف ہو اور چھوڑ دینے میں فساد کے وجود کا اندیشہ ہو۔

علامہ عینیؒ کے استنباط کا حاصل یہی ہے کہ اگر خلیفہ کی طرف سے تولیت و نامزدگی کے انتظار میں ضرر کا خطرہ ہو اور تعطل نیز ضیاعِ حقوق کا ظن غالب ہو تو خلیفہ کی طرف سے نامزدگی کے بغیر محض قوم کی رضامندی اور انتخاب سے بھی اسلامی عہدہ قبول کرنا درست ہے۔

علامہ بدرالدین عینیؒ نے مشہور شارح حدیث امام خطابیؒ صاحب معالم السنن کا ایک حکیمانہ استنباط اس حدیث کے ذیل میں نقل کیا ہے، اسے بھی یہاں درج کرنا مفید اور مناسب معلوم ہوتا ہے:

فصار هذا أصلاً في الضرورات اذا وقعت من معاظم امر الدين في انها لا تراعى فيها شرائط احكامها عند عدم الضرورة و كذا في حقوق آحاد الناس ايضاً، مثل ان يموت رجل بفلاة و خلف تركة، فان على من شهده حفظ ماله و ايصاله الى أهله و ان لم يوصى المتوفىٰ ذلک فان النصيحة واجبة للمسلمين (عمدۃ القاری، ج ۶، ص ۳۷۹)

(حضرخالد بن ولید کا واقعہ) اس شرعی قاعدہ کی اصل بن گیا کہ دن کے اہم امور کے بارے میں اگر ضرورت اور مجبوری کی صورت پیش آجائے تو اس وقت احکام کی ان شرطوں کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، جن شرطوں کا لحاظ ضرورت ومجبوری نہ ہونے کی صورت میں (عام حالات میں) ضروری ہوتا ہے، اسی طرح افراد امت کے انفرادی حقوق کے بارے میں بھی یہی ضابطہ ہوگا، مثلاً آبادی سے دور میدان میں کسی شخص کا انتقال ہوجائے، اور وہ ترکہ چھوڑے تو جو شخص بھی وہاں موجود ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ میت کے مال کی حفاظت کرکے اس کے گھر والوں تک پہنچادے، خواہ مرنے والے نے اسے ایسا کرنے کی وصیت نہ کی ہو، کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی واجب ہے۔

بحث کے ابتدائی حصہ میں بعض فقہاء مالکیہ کا یہ مسلک گذر چکا ہے کہ دارالاسلام کے وہ دور دراز علاقے جہاں خلیفۃ المسلمین نے کوئی قاضی مقرر نہیں کیا اور نہ ہی وہاں کے باشندوں کے لئے مسافت کی دوری یا دوسرے موانع کی بنا پر خلیفہ سے قاضی مقرر کرنے کی درخواست کرنا ممکن ہے، وہاں کے ارباب حل وعقد خود اپنے علاقہ کے لئے کوئی قاضی منتخب کرلیں گے۔

ان چند اشارات سے یہ بات نکھر کر آئینہ ہوگئی کہ اسلامی شریعت کسی حال میں اسلامی مناصب کے تعطل کو پسند نہیں کرتی، مسلم معاشرہ کی دینی یا دنیوی ضروریات کا انتظام جن ولایات اسلامیہ پر موقوف ہے اور جن عہدوں کے تعطل سے معاشرہ شدید ضرر وتنگی میں مبتلا ہوتا ہے، ان سب کا بندوبست بہر صورت کیا جانا ضروری ہے اگر خلیفہ وسلطان کی عدم موجودگی یا عدم احساس ذمہ داری یا معذوری کی وجہ سے مسلم معاشرہ کے ناگزیر اجتماعی ادارے اور عہدے تعطل کے شکار ہیں تو مسلم سماج کی ذمہ داری ہے کہ ان اجتماعی اداروں کو جاری کرے اور ان عہدوں کے لئے اہل افراد کا انتخاب کرے۔

چند وضاحتیں

بحث ختم کرنے سے پہلے چند وضاحتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

فقہ حنفی کی بعض عبارتوں سے استدلال کیا جاتا ہے کہ عامۃ المسلمین یا ارباب حل وعقد کی جانب سے نصب قاضی کسی حال میں جائز نہیں، اس سلسلہ میں خاص طور سے فتاویٰ عالمگیری کی درج ذیل عبارت پیش کی جاتی ہے۔

اذا اجتمع أهل بلدة على رجل و جعلوه قاضيا يقضى فيما بينهم لايصير قاضيا، ولو اجتمعوا على رجل و عقدوا معه عقد السلطنة أو عقد الخلافة يصير خليفة و سلطاناً. (فتاویٰ عالمگیری ج۳،ص۳۱۵)۔

اگر کسی شہر کے باشندوں نے متفق ہوکر ایک شخص کو قاضی بنا دیا تا کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ کرے تو وہ شخص (شرعاً) قاضی نہیں ہوگا، اور اگر شہر کے باشندوں نے متفق ہوکر کسی کو سلطان یا خلیفہ بنا دیا تو وہ شخص خلیفہ وسلطان ہوجائے گا۔

بلاشبہ یہ عبارت انتہائی واضح ہے لیکن اس سلسلہ میں مختلف فقہاء احناف کی عبارتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ مذکورہ بالا حکم عام حالات میں ہے جب کہ خلیفہ یا سلطان کے موجود ہونے کی وجہ سے عامۃ المسلمین کی طرف سے نصب قاضی کی ضرورت نہیں ہے، اگر شہر کے قاضی کا انتقال ہوگیا تو شہر کے باشندے خلیفہ وسلطان کو اطلاع کرکے نئے قاضی کا تقرر کراسکتے ہیں، اطلاع کرنے اور خلیفہ کی طرف سے نئے

قاضی کی نامزدگی میں اگر چند روز کی تاخیر ہوجاتی ہے تو مسلم معاشرہ کو کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا، مقدمات چند روز کے لئے ملتوی رہ سکتے ہیں، خلیفہ یا سلطان کی موجودگی میں کسی شہر کے باشندوں کی طرف سے ازخود قاضی مقرر کرنے کا عمل ایک طرح کی عملی بغاوت ہے۔ خلیفہ وسلطان مسلم اسی لئے ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے دینی عہدوں اور اجتماعی ضرورتوں کا نظم وانتظام کریں، امیر مسلم کی موجودگی میں عامۃ المسلمین کو نصب قاضی کا اختیار دینے میں انتشار اور بدنظمی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں یہ وضاحت موجود ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کا باطل ہونا صرف اس صورت میں ہے جب کہ اس کی ضرورت نہ ہو، جامع الفصولین میں ہے:

أهل البلدة لو تبايعوا على سلطنة أحد يصير سلطانا بخلاف القاضي لضرورة في الاول لا في الثاني. (جامع الفصولين، ج۱، ص۱۹)۔

اہل شہر اگر کسی شخص کی سلطنت پر بیعت کرلیں تو وہ سلطان ہوجائے گا، بخلاف قاضی کے، کیونکہ پہلی صورت میں ضرورت داعی ہے، دوسری صورت میں ضرورت داعی نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

اجتمع اهل البلدة و قدموا رجلا على القضاء لا يصح لعدم الضرورة وان مات سلطانهم واجتمعوا على سلطنة رجل جاز للضرورة (فتاویٰ بزازیہ، ج۲، ص۱۳۰، علی ہامش الجزء الخامس من الفتاویٰ الہندیہ، مطبوعہ دار الاحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اہل شہر نے مجتمع ہوکر قضاء کے لئے کسی مرد کو آگے بڑھایا تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ضرورت داعی نہیں ہے، اور اگر بادشاہ مرجائے اور کسی مرد کی سلطنت پر لوگ مجتمع ہوجائیں تو جائز ہے کیونکہ ضرورت داعی ہے۔

ہمارے بلند نظر فقہاء نے مسلمانوں کی طرف سے تقرر قاضی کے باطل ہونے کا جو حکم لگایا ہے اس کی علت ہی یہ بیان کی ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا یہ باطل ہے۔ فقہاء عظام کے سامنے بلادِ اسلامیہ کا مسلم معاشرہ تھا، جہاں اس بات کا تصور ہی نہیں تھا کہ کسی شہر یا علاقہ کے مسلمان امیرِ مسلم کے بغیر زندگی گذاریں اور یہ واقعہ ہے کہ امیر مسلم کی موجودگی میں عامۃ المسلمین کی طرف سے نصب قاضی کی ادنیٰ ضرورت نہیں ہے بلکہ اس میں ضرر وانتشار ہی کا خطرہ ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ غیر مسلم ممالک کے وہ علاقے جو امیر مسلم سے محروم ہیں، اور کسی امیر پر مجتمع ہونے کی پوزیشن میں وہاں کے مسلمان نہیں ہیں، وہاں بھی مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کی ضرورت نہیں ہے۔

فخر المتاخرین علامہ ابن عابدین شامی متوفیٰ ۱۲۵۲ھ نے اس مسئلہ سے متعلق فقہاء احناف کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد بڑے فیصلہ کن انداز میں تحریر فرمایا ہے:

قلت وهذا حيث لا ضرورة والا فلهم تولية القاضي ايضا كما ياتي بعد (شامی، ج۴، ص۳۴۲)

میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ (عامۃ المسلمین کی طرف سے نصب قاضی کا درست نہ ہونا) اس موقع کے لئے جہاں ہے ضرورت نہیں ہے، ورنہ عامۃ المسلمین کو تولیت قضاء کا بھی اختیار ہے جیسا کہ یہ مسئلہ اس کے بعد آئے گا۔

علامہ شامیؒ کی اس عبارت کا واضح مطلب یہ ہے کہ فقہاء احناف کی وہ عبارتیں جن

میں مسلمانوں کی طرف سے تقرر قاضی کو باطل قرار دیا گیا ہے ان کا تعلق عام حالات سے ہے، جب کہ سلطان یا امیر مسلم کی موجودگی کی وجہ سے مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن امتِ مسلمہ کے بحرانی حالات میں جبکہ خلیفہ وسلطان مسلم موجود نہیں اور مسلمان غیر مسلم حکومت کے زیر اقتدار ہیں وہاں عامۃ المسلمین کی طرف سے نصب قاضی کی شدید ترین ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ایسے حالات میں مسلمانوں کی طرف سے قاضی کا تقرر کیا جانا بالکل درست اور مقاصد شریعت سے ہم آہنگ عمل ہے، ظاہر بات ہے کہ ان بحرانی حالات میں بھی اگر عامۃ المسلمین کی طرف سے نصب قاضی کو باطل قرار دیا جائے گا تو قضاء شرعی کا عمل جو مسلم سماج کی اہم دینی ضرورت ہے موقوف ہو جائے گا، عمل قضاء کے موقوف ہونے سے امت مسلمہ ضیق وحرج میں مبتلا ہوگی، اصحاب حقوق کے حقوق مارے جائیں گے، ضرر وظلم کا دفعیہ نہ ہو سکے گا اور بہت سے عائلی مسائل جو قاضی کے بغیر حل نہیں ہو سکتے الجھے پڑے رہیں گے، اس لئے ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، فقہاء احناف اور علامہ شامی کی مذکورہ بالا تحقیق کی تائید مواقف ومقاصد کی ان عبارتوں سے بھی ہوتی ہے جنہیں ہم مقالہ کے شروع میں نقل کر چکے ہیں۔

اوپر علامہ شامیؒ کی جو عبارت نقل کی گئی اس میں انہوں نے کسی آنے والی عبارت کا حوالہ دیا ہے، اس کے بعد انہوں نے درمختار کے الفاظ **ولو کافراً** کی شرح کرتے ہوئے سب سے پہلے فتاویٰ تاتارخانیہ کی ایک عبارت نقل کی ہے اس کے بعد فتح القدیر کی عبارت نقل کی ہے، جس میں نصب امیر کا مسئلہ ذکر کیا گیا تھا، شامی کی عبارت بالا میں آنے والی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے مراد تاتارخانیہ ہی کی عبارت ہو سکتی ہے کیونکہ اسی

کے اندر عامۃ المسلمین کی طرف سے نصب قاضی کا ذکر ہے۔

واما بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد و یصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین فیجب علیهم طلب وال مسلم (شامی ج۴، ص۳۴۲)۔

جن شہروں پر غیر مسلم والی مقرر ہیں وہاں کے مسلمانوں کے لئے جمعہ اور عیدین قائم کرنا جائز ہے۔ (ایسے شہروں میں) مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی مقرر ہوگا، اس کے بعد وہاں کے مسلمانوں کے لئے مسلمان والی کی جستجو لازم ہے۔

فتح القدیر کی عبارت کو محولہ عبارت کا مصداق قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کا ذکر نہیں ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ مسلمان مجتمع ہو کر والی مقرر کریں اور منتخب شدہ والیِ مسلم قاضی مقرر کرے ظاہر ہے کہ یہ صورت مسلمانوں کی طرف سے نصب قاضی کی نہیں ہوئی جسے علامہ شامیؒ نے **والا فلهم تولیة القاضی** کے الفاظ سے بیان کیا ہے، بلکہ یہ تو عام صورت ہوئی کہ عامۃ المسلمین خلیفہ یا امیر کا انتخاب کریں اور خلیفہ یا امیر قاضی نامزد کرے۔

چند سوالات!

غیر مسلموں کے زیر تسلط شہروں اور علاقوں میں مسلمانوں کی جانب سے نصب قاضی کی صحت و جواز کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد چند اصولی سوالات پیدا ہوتے ہیں جو تقرر قاضی کے طریقۂ کار سے متعلق ہیں۔(۱) تراضی مسلمین سے تمام مسلمانوں کی تراضی مراد ہے یا صرف اہل حل وعقد کی تراضی مراد ہے۔(۲) اگر اہل حل وعقد کی تراضی مراد ہے تو اہل حل وعقد کا مصداق کون لوگ ہیں۔(۳) تمام اہل حل وعقد کی تراضی مراد ہے یا بعض کی یا اکثر کی، ذیل میں ہم ان تینوں سوالات کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اوپر کے تینوں سوالوں کا حل تلاش کرنے کے لئے ہمیں نصب امام کے مسئلہ کا مطالعہ کرنا پڑے گا، امامت کا مسئلہ اصلاً ایک فقہی مسئلہ ہے لیکن چونکہ امامت کا مسئلہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بڑا معرکۃ الآراء رہا ہے اور اس مسئلہ کی بنا پر متعدد فرقے وجود میں آئے ہیں، نیز شیعوں کے عقیدۂ امامت کی وجہ سے مسئلہ امامت کا رشتہ عقائد سے بھی جڑ گیا ہے، اس لئے متکلمین اسلام نے امامت کے مسئلہ کو اولین اہمیت دی، مسئلہ امامت پر متکلمانہ اور مناظرانہ بحثیں کیں، فقہاء اسلام نے متکلمین پر تکیہ کر کے مسئلہ امامت سے زیادہ اعتناء نہیں برتا، متکلمین کی بحثیں اور نکتہ آفرینیاں اپنی جگہ پر بڑی مفید اور گراں قدر ہیں، لیکن ان کی تحریروں سے نصبِ امام کے فقہی اور قانونی پہلو پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی، الاحکام السلطانیہ کے موضوع پر فقہاء اسلام کی کتابوں نے امامت کے فقہی اور قانونی پہلو کو خاصا اجاگر کیا ہے۔

قضاء کا مسئلہ امامت کے مسئلہ سے جڑا ہوا ہے، اصلاً امام المسلمین ہی کا فریضہ ہے کہ وہ فصل خصومات کا کام انجام دے، لیکن چونکہ امام اپنی گوناگوں اجتماعی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس فریضہ کی ادائیگی نہیں کرسکتا، اس لئے شریعت نے امام کو مکلّف بنایا ہے کہ اسلامی مملکت کے ہر ہر علاقے اور شہر میں قاضی مقرر کرے تاکہ اسلامی مملکت کے تمام باشندے بہ سہولت انصاف حاصل کرسکیں اور اپنے مقدمات فیصل کرا سکیں، عمل قضاء امامت ہی کا ایک اہم جز ہے اس لئے امام وسلطان کی عدم موجودگی میں نصب قاضی کا اختیار انہیں افراد کے ہاتھوں میں آئے گا جو شرعاً نصب امام کے مجاز ہوتے ہیں۔

نصب قاضی کی ذمہ داری کس پر؟

نصب امام اور نصب قاضی دونوں فرض کفایہ ہیں، فرض کفایہ ادا کرنے کی ذمہ داری امت پر من حیث المجموع عائد ہوتی ہے، انفرادی طور پر ہر فرد فرض کفایہ کا مکلّف نہیں ہوتا ہے اسے ادا کرنے کی اولین ذمہ داری ان افراد پر عائد ہوتی ہے جو اسے ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں یا اس کی ادائیگی میں کسی طرح کی مدد کرسکتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ نصب امام کی اہلیت ہر شخص میں نہیں ہوتی، نصب امام کے مسئلے میں وہی شخص رائے دینے اور دخیل بننے کی اہلیت رکھتا ہے، جو کم از کم یہ جانتا ہو کہ امام المسلمین میں کیا اوصاف اور اہلیتیں شرعاً ضروری ہیں؟ اور حالات کے پیش نظر کس شخص کا انتخاب اس اہم کام کے لئے موزوں رہے گا، اسی لئے فقہاء ومتکلمین نے عام مسلمانوں کو نصب امام کا مجاز نہیں قرار دیا بلکہ اہل حل و عقد یا دوسرے الفاظ میں اہل اختیار کو نصب امام کا مجاز ٹھہرایا۔

امام ابوالحسن ماوردیؒ نے لکھا ہے:

والامامة تنعقد من وجهين: احدهما باختيار اهل الحل و العقد، والثانی بعهد الامام من قبل (الاحکام السلطانیہ ص٦)

امامت کا انعقاد دو طریقوں سے ہوتا ہے، پہلا طریقہ اہل حل وعقد کا منتخب کرنا، دوسرا طریقہ سابق امام وخلیفہ کی طرف سے نامزدگی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ انعقاد خلافت کے مختلف طریقوں پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

طریق اول بیعت اہل حل وعقد است (ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء، ج١، ص١٤)

انعقاد خلافت کا پہلا طریقہ اہل حل وعقد کا بیعت کرنا ہے۔

نصب امام کی طرح نصب قاضی کا تعلق بھی عوام سے نہیں بلکہ اہل حل وعقد سے ہوتا ہے جو عامۃ المسلمین کے نمائندہ اور رہنما ہوتے ہیں۔ لہذا جس شہر یا جس علاقہ کے لئے قاضی مقرر کرنا ہے وہاں کے اہل حل وعقد ہی اس کا انتخاب کر سکتے ہیں، یہاں اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اسلام میں مغربی طرز کی جمہوریت کی گنجائش نہیں ہے جس میں ہر شخص ہر مسئلہ پر بولنے اور رائے زنی کا حق رکھتا ہے، اسلام نے یہ تصور دیا ہے اور اس پر اصرار کیا ہے کہ کسی موضوع پر اور کسی عہدہ ومنصب کے بارے میں انہیں افراد کی رائے قابل لحاظ قرار دی جائے گی جو اس موضوع اور منصب کی حقیقت، دائرۂ کار اور اس عہدہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مطلوبہ صفات کی پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس مختصر بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ نصب قاضی کی ذمہ داری اصلاً اہل حل و عقد پر عائد ہوتی ہے اور وہی لوگ شرعاً نصب قاضی کا اختیار رکھتے ہیں۔

اہل حل وعقد کی تشریح

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اہل حل وعقد کا مصداق کون لوگ ہیں، اس سلسلے میں متکلمین وفقہاء کے یہاں دو رائیں ملتی ہیں۔

شارح مقاصد نے اہل حل وعقد کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے "**من العلماء والرؤساء ووجوہ الناس**" (شرح المقاصد ج٢ ص٢٧٢) شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں انعقاد خلافت کی بحث میں لکھا ہے:

طریق اول بیعت اہل حل وعقد است از علماء وقضاۃ وامراء ووجوہ الناس (ازالۃ الخفاء، ج١، ص١٤)

پہلا طریقہ علماء، قضاۃ، امراء، اعیان قوم میں سے اہل حل وعقد کا بیعت کرنا ہے۔

اس تشریح کے اعتبار سے اہل حل وعقد میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بااثر اور نمائندہ افراد شامل ہو جاتے ہیں، جن کی پشت پناہی سے خلیفہ کو غلبہ واقتدار حاصل ہونے کا ظن غالب ہو۔

دوسرا نظریہ مشہور شافعی فقیہ امام ابوالحسن ماوردیؒ کا ہے، انہوں نے اہل حل وعقد کے بجائے "اہل اختیار" کی اصطلاح اختیار کی ہے، انہوں نے امامت کی بحث میں لکھا ہے کہ اہل اختیار وہ افراد کہلائیں گے جن میں تین اوصاف پائے جائیں:

اما اهل الاختيار فالشروط المعتبرة فيهم ثلاثة، احدها العدالة الجامعة لشروطها والثانی العلم الذی يتوصل به الی معرفة من يستحق الامامة علی الشروط المعتبرة فيها، والثالث الرأی

والحکمة المودیان الی اختیار من هو اصلح للامامة و بتدبیر المصالح أقوم و أعرف (الاحکام السلطانیہ ص ۶)

جہاں تک اہل اختیار کی بحث کا تعلق ہے تو ان میں قابل لحاظ شرطیں تین ہیں (۱) ایسی عدالت جو تمام شرطوں کی جامع ہو۔ (۲) ایسا علم جس سے یہ جانا جاسکے کہ امامت کا مستحق کون شخص ہوتا ہے یعنی شرائط امامت کا علم، (۳) اصابت رائے اور حسن تدبیر جس کی روشنی میں ایسے شخص کا انتخاب کر سکے جو امامت کے لئے لائق ترین ہو اور مصالح قوم کی تدبیر سے خوب واقف اور قابو یافتہ ہو۔

اس تشریح کے اعتبار سے اہل اختیار کا دائرہ مختصر سے مختصر ہو گیا ہے، مثلاً انتخاب قاضی کے مسئلہ میں صرف وہ افراد اہل اختیار شمار ہوں گے جو شرعی اصطلاح میں عادل ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا علم بھی رکھتے ہوں، جس کی روشنی میں جان سکیں کہ قاضی میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے، اور اہلیت قضاء کے لئے کیا شرطیں ہیں، نیز اپنے معاشرے اور حالات کا اچھا مطالعہ رکھتے ہوں تا کہ منصب قضاء کے لئے کسی اہل اور موزوں آدمی کا انتخاب کر سکیں۔

میرے خیال میں ماوردیؒ کا نظریہ اصولی اعتبار سے بہت درست اور جامع ہے لیکن جن متکلمین وفقہاء نے اہل حل وعقد کے دائرے میں وسعت پیدا کر کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بااثر اور نمائندہ افراد کو بھی اہل حل وعقد میں شامل کیا ہے۔ ان کا فقہی نظریہ بھی بڑی حکمت اور حالات کے حقیقت پسندانہ مطالعہ پر مبنی ہے، ہمارے متکلمین وفقہاء کرام کے سامنے دارالاسلام کا معاشرہ تھا جس میں سطوت واقتدار کے بغیر امام کا منصب امامت پر باقی رہنا ممکن نہ تھا، اگر امام قوت واقتدار سے عاری ہوتا تو کوئی طاقتور اور صاحب اقتدار

شخص دارالاسلام پر غلبہ حاصل کر کے اسے منصب امامت سے محروم کر دیتا، کیونکہ تغلب کی صورت میں ہر شرط ساقط ہو جاتی ہے اور متغلب کو مجبوراً امام وسلطان تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس لئے ہمارے حقیقت پسند فقہاء ومتکلمین نے اہل اختیار کے دائرہ میں وسعت پیدا کر کے ہر شعبۂ زندگی کے نمائندہ اور بااثر افراد کو اس میں شامل کر لیا تا کہ منتخب امام کو زبردست پشت پناہی حاصل ہو، اسے غلبہ واقتدار حاصل ہو جائے اور کوئی شخص اس کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی جرأت نہ کرے، اسی لئے بعض متکلمین نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ امت کے معاملات کی گرہ کشائی اگر تنہا ایک شخص کے ہاتھ میں آجائے اور وہی در وبست کا مالک ہو جائے، پوری امت اس کی پشت پر ہو اور اس پر مکمل اعتماد کرتی ہو تو تنہا اس شخص کا بیعت کر لینا انعقاد امامت کے لئے کافی ہے۔ (شرح المقاصد، ج ۲، ص ۲۷۲)۔

غیر مسلموں کے زیر تسلط علاقوں میں بسنے والے مسلمان اپنے لئے جو امیر یا قاضی منتخب کرتے ہیں، اس میں اگر چہ مادی شوکت واقتدار اور فوجی غلبہ وبرتری کا سوال نہیں پیدا ہوتا، نہ اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اپنا غلبہ واقتدار حاصل کر لے، لیکن اخلاقی تائید اور معنوی اثر ونفوذ کی ضرورت سے یہاں بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے بنیادی طور پر انتخاب قاضی کا کام اگر چہ وہی افراد انجام دیں گے، جن میں امام ماوردیؒ کے ذکر کردہ تینوں اوصاف موجود ہوں، لیکن مقاصد شریعت کو بروئے کار لانے کے لئے ثانوی طور پر مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متدین وبااثر افراد کو انتخاب قاضی کے عمل میں شریک کرنا ضروری ہے تا کہ قاضی کو زیادہ سے زیادہ عوامی تعاون واعتماد اور اخلاقی قوت حاصل ہو جائے اور لوگ اس کے فیصلے سے انحراف نہ کر سکیں، سماجی اور اخلاقی دباؤ مادی قوت سے زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتا ہے۔

کیا نصب قاضی کے لئے اتفاق شرط ہے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی شہر یا کسی علاقہ میں نصب قاضی کرنے کے لئے وہاں کے تمام اہل حل وعقد کا اتفاق شرط ہے یا اکثریت کا، یا صرف بعض اہل حل وعقد کا قاضی مقرر کر دینا صحیح اور کافی ہے؟

تمام اہل حل وعقد کے متفق ہونے کی شرط بداہۃً باطل ہے، کیونکہ اگر اتفاق کی شرط کو درست مان لیا جائے تو شاذ و نادر ہی کسی جگہ امیر یا قاضی مقرر ہو سکے گا، تمام اہل حل وعقد کا اجتماع و اتفاق عقلاً ممکن ضرور ہے لیکن عادۃً اور عملاً ممکن نہیں، خصوصاً آج کل کے حالات میں اور کفار کے زیر اقتدار بسنے والے مسلمانوں میں۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب پر بھی تمام اہل حل وعقد متفق نہ ہو سکے تھے، انتخاب خلیفہ میں تمام اہل حل وعقد کے اتفاق کو شاہ ولی اللہؒ نے اسی بنا پر باطل قرار دیا ہے کہ ایسا ہونا ممتنع ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

> وانفاق اہل حل وعقد جمیع بلاد اسلام شرط نیست، زیرا کہ آں ممتنع است، (ازالۃ الخفاء، ج ا، ص: ۱۴، ۱۵)۔
>
> تمام بلاد اسلامیہ کے اہل حل وعقد کا اتفاق شرط نہیں ہے، کیوں کہ ایسا اتفاق محال ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> من قال انه يصير اماما بموافقة واحد او اثنين او اربعة وليسوا هم ذوى القدرة والشوكة فقد غلط كما ان من ظن ان تخلف الواحد او الاثنين او العشرة يضر فقد غلط (منهاج السنة، ج ا

> ص ۱۹۰، مطبوعہ مکتبۃ الریاض الحدیثۃ)۔
>
> جو شخص یہ کہے کہ ایک یا دو یا چار ایسے افراد جنہیں اقتدار اور شوکت بھی حاصل نہ ہو ان کے اتفاق کر لینے سے کوئی آدمی امام بن جائے گا وہ غلطی پر ہے، جس طرح وہ شخص غلطی پر ہے جو سمجھتا ہے کہ ایک یا دو یا دس افراد کا بیعت نہ کرنا انعقادِ خلافت میں مانع ہے۔

غیر مسلم سلطنت واقتدار میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے انتخاب قاضی کا طریقہ کیا ہوگا، اس کے بارے میں فقہ حنفی میں تفصیل نہیں ملتی، ہاں فقہاء شافعیہ کے یہاں نسبۃً زیادہ تفصیلات ملتی ہیں، فتاویٰ کبریٰ میں علامہ ابوالحسن الصحی شافعی کا فتویٰ ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

> اذا عدم فى قطر ذو شوكة و حاكم ولم يوجد للمرأة ولى ولا للاطفال وصى فهل لجماعة من اهل البلاد نصب فقيه يتعامل الاحكام فى الابضاع والاموال فاجاب الاصبحى رحمه الله بقوله نعم اذا لم يكن رئيس يرجع امرهم اليه اجتمع ثلاثة من اهل الحل و العقد و نصبوا قاضياً (الفتاویٰ الکبریٰ لابن حجر المکی الہیتمی جلد ۴ ص، ۳۲۶)۔
>
> (سوال کیا گیا) کہ جب کسی علاقہ میں حاکم نہ رہے، اور عورتوں کے لئے ولی نہ ہو اور بچوں کے لئے وصی نہ ہو تو کیا شہر کے لوگوں میں سے کسی جماعت کو یہ اختیار ہے کہ قاضی نصب کرے جو لوگوں کے ناموس اور اموال کے احکام انجام دے، تو علامہ اصبحیؒ نے جواب دیا کہ ہاں جب امیر نہ رہے جو شرعی امور کا مرجع ومرکز ہو تو اہل حل وعقد میں سے تین شخص جمع ہوں اور قاضی مقرر کر لیں۔

علامہ اصبحیؒ کے مذکورہ بالا فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نصب قاضی کے

لئے اہل حل وعقد کی اکثریت کا مجتمع ہونا بھی ضروری نہیں، لیکن فقہاء شافعیہ کی دوسری عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس محفل میں انتخاب قاضی ہو اس میں اگر چہ سارے یا اکثر حل وعقد کی کی شرکت شرط نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اسے عموماً اہل حل وعقد کی تائید اور رضامندی حاصل ہو، فقہ شافعی کی مشہور کتاب فتح المعین میں ہے:

لا بد من تولية من الامام او ماذونه ولو لمن تعين للقضاء، فان فقد الامام فتولية اهل الحل و العقد فی البلد او بعضهم مع رضا الباقين ولو ولاه اهل جانب من البلد صح فيه دون الآخر (فتح المعين، ص:۲۱۰،۲۱۱)۔

امام یا اس کے اجازت یافتہ شخص کی طرف سے منصب قضاء کی تفویض ضروری ہے، اس شخص کے لئے بھی جو اہلیت قضاء میں تنہا ہو اگر امام مفقود ہو تو شہر کے تمام اہل حل وعقد کی طرف سے تفویض قضاء ضروری ہے، یا بعض نے تفویض کی ہو، باقی لوگوں کی رضامندی کے ساتھ، اگر شہر کے ایک جانب والوں نے قاضی بنایا ہے تو انہیں کے حق میں قضاء صحیح ہوگی، دوسری جانب والوں کے لئے نہیں۔

صاحب فتح المعین کی مذکورہ تحقیق فقہاء احناف کی اس عبارت سے قریب تر ہے۔

ویصير القاضی قاضيا بتراضی المسلمين

(کفار کے زیر اقتدار والے علاقوں میں) مسلمانوں کی رضامندی سے منصب قضاء کا انعقاد ہوگا۔

حاصل کلام

فقہاء کرام کی ان عبارتوں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب قاضی ایسے طریقے سے ہو جس سے مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا ہو سکے، اہل حل وعقد اور عامۃ المسلمین کی

غالب اکثریت کو اس پر اعتماد ہو، ایسا نہ ہو کہ چند افراد جنہیں چند فیصد خواص وعوام کا بھی اعتماد حاصل نہیں ہے کسی قاضی کا انتخاب کر لیں، اور مسلمانوں میں ایک نیا انتشار پیدا ہو جائے۔

علامہ صالح تونسیؒ مالکی نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مشہور سوال کے جواب میں فرمایا:

و نصب جماعة المسلمين لقاض يفصل بينهم الخصومات و يقطع المنازعات جائز بل يتعين على الاعيان اذا وجدوا سبيلا اليه و عدم معارض و اجتماع الكلمة عليه (الحیلۃ الناجزہ، ص۱۶۵)۔

مسلمانوں کی جماعت کا ایک قاضی مقرر کرنا جو ان کے مقدمات کا فیصلہ کرے اور نزاعات کو ختم کرے جائز ہے بلکہ بعض اوقات قاضی مقرر کرنا سر برآوردہ افراد پر واجب ہوتا ہے، جب کہ ایسا کرنا ان کے لئے ممکن ہو، مخالفت نہ ہو، اور اجتماعیت قائم ہو جائے۔

اس عبارت کا بھی حاصل یہی ہے کہ نصب قاضی اس طور سے ہونا چاہئے کہ اس سے مسلمانوں میں اجتماعیت قائم ہو، بڑے سے بڑے پیمانے پر تراضی واتفاق حاصل ہو سکے، یہ بات محتاج بیان نہیں کہ محض چند فیصد افراد سے نہ اجتماعیت کا قیام عمل میں آتا ہے نہ چند افراد کی مخالفت سے وحدت واجتماعیت پارہ پارہ ہوتی ہے۔

خلاصۂ بحث

گذشتہ صفحات میں جو بحث پیش کی گئی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی آباد ہوں نظامِ قضاء قائم کرنا ان کا دینی اجتماعی فریضہ ہے، فقہاء نے تقرر قاضی کو فرض قرار دیا ہے، کیونکہ اپنے تنازعات اور مقدمات کا فیصلہ اسلامی قوانین کے مطابق کرانا قرآنی تصریحات کے مطابق مسلمانوں پر فرض ہے اور یہ کام نصب قاضی کے بغیر انجام نہیں پاسکتا، امیر المؤمنین یا سلطانِ مسلم کی موجودگی میں دوسرے دینی واجتماعی کاموں کی طرح قضاء شرعی کا نظام قائم کرنے کی ذمہ داری بھی امیر وسلطان کے اوپر عائد ہوتی ہے۔لیکن جن علاقوں میں کوئی مسلمان حاکم موجود نہیں ہے بلکہ مسلمان غیر مسلموں کے زیر اقتدار آگئے ہیں، اور وہاں کا حاکم غیر مسلم ہے، ایسے علاقوں میں دین کے اجتماعی شعبوں کے نظم وانتظام کی ذمہ داری عامۃ المسلمین کے سر آجاتی ہے، اور وہاں کے اہل حل وعقد عامۃ المسلمین کے نمائندہ کی حیثیت سے ان اجتماعی کاموں کی انجام دہی کے ذمہ دار ہیں، کفار کے زیر تسلط شہروں اور علاقوں میں اہل حل وعقد کی طرف سے نصب قاضی کا درست ہونا علم کلام کی اہم کتابوں میں مذکور ہے، اور چاروں فقہی مسالک کی مستند کتابوں میں بھی۔

ہندوستان کے موجودہ نازک تر حالات میں جب کہ اسلامی شریعت کو بڑے اہم چیلنجوں اور خطرات کا سامنا ہے مسلمانان ہند کی دینی ذمہ داری ہے کہ پورے ہندوستان میں قضاء شرعی کا نظام قائم کریں، مسلمانوں میں ایسی فضاء بنائیں کہ وہ اپنے تنازعات خصوصاً عائلی مقدمات سرکاری عدالتوں میں لے جانے کے بجائے اپنے اپنے علاقہ کے دارالقضاء میں لے جائیں اور وہاں کے فیصلوں کو خوشی خوشی اپنے اوپر نافذ کریں۔

طریقۂ کار

ہندوستان کے موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قضاء کا کام ''کل ہند'' پیمانے پر شروع کرنے کے بجائے مختصر پیمانے پر شروع کیا جائے، ایک ضلع یا چند تحصیلوں کو ایک اکائی مان کر نظام قضاء قائم کرنے کی جد وجہد کی جائے، پورے ضلع کا دورہ کر کے گاؤں گاؤں، قصبے قصبے جا کر نظام قضاء کی ضرورت اور افادیت سمجھائی جائے، پورے ضلع کے سرکردہ افراد خصوصاً علماء کو جوڑنے اور متحد کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جائے، ذاتی اور جماعتی مفادات، گروہی تعصّبات سے بلند ہو کر اگر محنت کی جائے تو اتحاد پیدا ہونا کوئی مشکل کام نہیں، پورے علاقہ میں فضا تیار اور سازگار ہونے کے بعد کسی معاملہ فہم، مخلص، بردبار، باصلاحیت عالم فقیہ کو قاضی منتخب کرلیا جائے اور انتخاب میں مکمل اتفاق یا بڑے پیمانے پر تراضی وتائید حاصل کرنے کی انتھک کوشش کی جائے تاکہ اجتماعیت قائم ہوجائے اور گروہ بندی کی نوبت نہ آئے۔

اگر کسی ایک قاضی پر اتفاق وتراضی ممکن نہ ہو تو فقہ حنفی کے اعتبار سے اس کی بھی گنجائش ہے کہ ایک ہی جگہ کئی قاضی مقرر کردئے جائیں ایک ''قاضی کونسل'' تشکیل دے دی جائے جس میں قضاء کی اہلیت رکھنے والے متعدد علماء شامل ہوں اور ''قاضی کونسل'' کے ارکان مل جل کر قضاء کا طریقۂ کار طے کرلیں، ''قاضی کونسل'' کے اندر انہیں علماء کو رکھا جائے جن میں قضاء کی اہلیت ہو، ''قاضی کونسل'' پر اتفاق حاصل کرنا ایک قاضی پر اتفاق حاصل کرنے کے مقابلہ زیادہ آسان ہے۔

علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی متوفی ۶۳۰ھ نے اپنی مشہور کتاب ''المغنی'' (المغنی

درشرح الکبیر ج ۱۱،ص ۴۸۲-۴۸۱ مطبوعہ دارالکتاب العربی، بیروت) میں ایک ہی شہر میں ایک سے زیادہ قاضی مقرر کرنے کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے اگر ایک ہی شہر میں دو یا دو سے زیادہ قاضی مقرر کئے گئے، اور ہر ایک کا دائرہ عمل الگ الگ متعین کر دیا گیا، مثلاً ایک کے سپرد مالی مقدمات کئے گئے، دوسرے کے سپرد نکاح وطلاق وغیرہ کے لئے مقدمات کئے گئے یا ہر قاضی کے لئے شہر کا ایک علاقہ مخصوص کر دیا گیا تو ان صورتوں میں کئی قاضیوں کا تقرر بالاتفاق درست ہے، اور اگر ایک ہی شہر میں دو یا دو سے زیادہ قاضی اس طور پر مقرر کئے کہ نہ ہر ایک کا دائرہ عمل الگ کیا، نہ علاقے مخصوص کئے تو فقہ حنفی میں ایسا کرنا جائز ہے، حنبلی فقہاء بھی اسے جائز کہتے ہیں، فقہ شافعی میں بھی ایک قول کے اعتبار سے درست ہے، ابن قدامہ نے بھی اسی قول کو اصح قرار دیا ہے، لیکن فقہ شافعی کے دوسرے قول کے اعتبار سے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

مشہور شافعی فقیہ امام ابوالحسن ماوردی متوفی ۴۵۰ھ نے اپنی گرانمایہ کتاب ''ادب القاضی'' میں مسئلہ بالا پر بحث کرتے ہوئے فقہ شافعی کے اسی قول کو راجح، (ادب القاضی ج ۱،ص ۱۵۷-۱۵۸ مطبوعہ مطبعۃ الارشاد بغداد، تحقیق محی ہلال السرحان) قرار دیا ہے جس میں دائرہ عمل اور علاقوں کی تقسیم کے بغیر بھی ایک شہر میں کئی قاضیوں کے تقرر کو جائز کہا گیا ہے۔

اغراض ومقاصد

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

ہندوستان میں ''مسلم پرسنل لا'' کے تحفظ اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرنا۔

بالواسطہ، بلاواسطہ یا متوازی قانون سازی جس سے قانون شریعت میں مداخلت ہوتی ہو، عام ازیں کہ وہ قوانین پارلیمنٹ یا ریاستی مجلس قانون ساز میں وضع کئے جا چکے ہوں یا آئندہ وضع کئے جانے والے ہوں یا اس طرح کے عدالتی فیصلے جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا ذریعہ بنتے ہوں انہیں ختم کرانے یا مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی جدوجہد کرنا۔

مسلمانوں کو عائلی ومعاشرتی زندگی کے بارے میں شرعی احکام وآداب، حقوق وفرائض اور اختیارات وحدود سے واقف کرانا اور اس سلسلہ میں ضروری لٹریچر کی اشاعت کرنا۔

شریعت اسلامی کے عائلی قوانین کی اشاعت اور مسلمانوں پر ان کے نفاذ کیلئے ہمہ گیر فاکہ تیار کرنا۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک کے لیے بوقت ضرورت ''مجلس عمل'' بنانا جس کے ذریعہ بورڈ کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی خاطر پورے ملک میں جدوجہد منظم کی جا سکے۔

علماء اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک مستقل کمیٹی کے ذریعہ مرکزی یا ریاستی حکومتوں یا دوسرے سرکاری ونیم سرکاری اداروں کے ذریعہ نافذ کردہ قوانین اور تشفی احکام (Circulars) یا ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے والے مسودات قانون (بل) کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے رہنا کہ ان کا مسلم پرسنل لا پر کیا اثر پڑتا ہے۔

مسلمانوں کے تمام فقہی مسلکوں اور فرقوں کے مابین خیر سگالی، اخوت اور باہمی اشتراک وتعاون کے جذبات کی نشوونما کرنا، اور ''مسلم پرسنل لا'' کی بقاوتحفظ کے مشترکہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کے درمیان ربط اور اتحاد واتفاق کو پروان چڑھانا۔

ہندوستان میں نافذ ''محمڈن لا'' کا شریعت اسلامی کی روشنی میں جائزہ لینا اور نئے مسائل کے پیش نظر مسلمانوں کے مختلف فقہی مسالک کے تحقیقی مطالعہ کا اہتمام کرنا اور شریعت اسلامی کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے کتاب وسنت کی اساس پر ماہرین شریعت اور فقہ اسلامی کی رہنمائی میں پیش آمدہ مسائل کا مناسب حل تلاش کرنا۔

بورڈ کے مذکورہ بالا اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے وفود کو ترتیب دینا، Study Teams تشکیل دینا، سمینار، سمپوزیم، خطابات، اجتماعات، دوروں اور کانفرنسوں کا انتظام کرنا، نیز ضروری لٹریچر کی اشاعت اور بوقت ضرورت اخبارات ورسائل اور خبرناموں وغیرہ کا اجراء اور اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے دیگر ضروری امور انجام دینا۔